اِسلامی ثقافت

اور دورِ جدید

مارماڈیوک ولیم پکتھال

منشورات

اسلامی ثقافت
اور دورِ جدید

اسلامی ثقافت
اور
دورِ جدید

محمد مارماڈیوک پکھتال

ترجمہ: توراکینہ قاضی

منشورات

نام کتاب : اسلامی ثقافت اور دورِ جدید

مصنف : محمد مارماڈیوک پکھتال

ترجمہ : توراکینہ قاضی

طبع اول : مارچ ۲۰۰۳ء

تعداد : ۱۱۰۰

ناشر : منشورات، منصورہ، ملتان روڈ، لاہور-۵۴۵۷۰

فون: ۵۴۲۵۳۵۶، فیکس: ۵۴۳۲۱۹۴

manshurat@hotmail.com

مطبع : عرفان افضل پرنٹرز، بندر روڈ، لاہور

قیمت : روپے

ترتیب

خطبہ سوم

اخوت

خطبہ چہارم

سائنس، فنون اور ادب

خطبہ پنجم

رواداری

خطبہ ششم

تقدیر پرستی

خطبہ ہفتم

اسلام میں عورت کا مقام

خطبہ ہشتم

اللہ اور رسولؐ کی حکمرانی یعنی اسلامی حکومت

پیش لفظ

مغرب اور اسلام یا اسلام اور مغرب اس دور کا گرم موضوع ہے۔ چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی ہمیشہ ہی ستیزہ کار رہا ہے لیکن ہر دور کے افراد اپنے دور کو ہی تاریخ سمجھتے ہیں جب کہ تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی ہوتی ہے۔

مغرب سے تعامل کی وجہ سے آج جو تہذیبی اور ثقافتی مسائل مسلمانوں کو درپیش ہیں، محسوس ہوتا ہے کہ نئے اور جدید ہیں۔ ماضی قریب کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو ایسے نئے اور جدید بھی نہیں ۷۰، ۷۵ برس قبل اور اس سے بھی قبل، ہندستان پر برطانوی قبضے کے بعد جو دور گزرا، یہ اس دور کے بھی مسائل ہیں۔ ان مسائل کے حوالے سے اسلامی موقف کو پیش کرنے کے لیئے بہت کچھ لکھا گیا۔ لیکن جو بات مغرب کے اپنے فرزند کی زبان وقلم میں ہو سکتی ہے۔ وہ کسی سکہ بند عالم کے بیان میں شاید نہ ملے۔

محترم محمد مارماڈیوک پکھتال۔ (۱۸۰۹۔۱۹۳۶) جن کے حالات کچھ صاحب کتاب کے بارے میں بھی ملیں گے۔ ایسے ہی فرد تھے۔

مدراس کے خطبات کی ایک وجہ شہرت سید سلیمان ندوی کے چھ خطبات ہیں جن کو ہم خطبات مدارس پڑھتے تھے۔ دوسرے علامہ اقبال کے مشہور زمانہ چھ خطبات۔ پکھتال کے یہ خطبات بھی مدراس میں دیئے گئے۔ اسی طرز پر اسلامی جامعہ بہاولپور نے ڈاکٹر محمد حمید اللہؒ اور ڈاکٹر محمود احمد غازی کے خطبات بہاولپور کروائے اور اب جامعہ پنجاب میں خطبات لاہور کا سلسلہ اس روایت کا تسلسل ہے۔ اس کتاب کے موضوعات کی وسعت کا

کا اندازہ فہرست سے کیا جا سکتا ہے۔ تورا کینہ قاضی صاحبہ نے اسے خوبصورت رواں اور شستہ اردو قالب میں ڈھال کر ایک بڑی خدمت انجام دی ہے۔ اسلام کے حوالے سے جدید ذہین میں جو موضوعات گردش کر رہے ہیں' یہ کتاب ان کے لیے روشنی فراہم کرتی ہے۔ امید ہے کہ منشورات کی اس کتاب کو جدید وقدیم ہر طرح کے لوگ مفید پائیں گے۔

کچھ صاحب کتاب کے بارے میں

نورا کینہ قاضی

مترجم قرآن، مفکر اسلام، ادیب، محقق، صحافی اور مبلغ و خطیب محمد مارماڈیوک پکتھال بلا شبہ ان شخصیات میں سے ہیں جو صدیوں بعد پیدا ہوتی ہیں اور صدیوں کو متاثر کرتی ہیں۔ وہ غیر معمولی صلاحیتوں کے حامل نابغہ انسان تھے۔ ان پر قدرت خداوندی کا سب سے بڑا کرم یہ تھا کہ اگر چہ وہ گھٹا ٹوپ اندھیروں میں پیدا ہوئے مگر ان کی عقل سلیم انہیں اسلام کی سیدھی اور روشن شاہراہ پر لے آئی۔ اور بہت سی دیگر تصنیفات کے علاوہ انہوں نے خصوصاً ترجمۂ قرآن کی صورت میں انگریزی خواں طبقے کو ایک ایسا انمول تحفہ عطا کیا جو تا قیامت راہ روان شوق کی رہنمائی کرتا رہے گا۔ اور خود پکتھال مرحوم کے لیے بھی بے بہا صدقۂ جاریہ کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔

مارماڈیوک ولیم پکتھال ۷ اپریل ۱۸۷۵ء کی صبح برطانیہ میں سفوک کے قریب ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد چارلس گرے پکتھال مقامی گرجا کے پادری تھے۔ ان کی والدہ کا نام میری تھا۔ وہ امیر البحر ڈی ایچ او برائن کی بیٹی تھیں۔ چارلس کی پہلی بیوی سے دس بچے تھے۔ میری سے شادی انھوں نے پہلی بیوی کو موت کے بعد کی تھی۔ اس بیوی سے چارلس کے ہاں مارماڈیوک کی تولد ہوئے۔ مارماڈیوک کی زندگی کے ابتدائی چھ برس دیہاتی مدرسے کی پاک فضا میں گزرے۔ پھر جب ان کے والد کا انتقال ہو گیا تو ان کا خاندان گاؤں سے ترکِ سکونت کر کے لندن آ گیا اور کنگسٹن میں

مکان لے کر رہنے لگا۔ یہاں مارماڈیوک کو نارفوک کے ایک سکول میں داخل کر دیا گیا۔ یہاں شروع ہی میں انھوں نے اپنی ذہانت کا سکہ جما لیا۔ خصوصاً ریاضی میں بھر پور قابلیت کا مظاہرہ کیا۔ مگر کچھ عرصہ کے بعد وہ سخت بیمار ہو گئے اور ڈاکٹروں نے ایک سال کے لیے آرام تجویز کیا۔

مکمل صحت یابی کے بعد پکتھال کو ہیرو کے مشہور و معروف پبلک اسکول میں داخل کروا دیا گیا' جہاں انھوں نے جغرافیہ اور لسانیات میں امتیاز حاصل کیا۔ زمانۂ طالب علمی میں ان کی ونسٹن چرچل سے دوستی ہو گئی جو آخری وقتوں تک قائم رہی۔ چرچل نے آگے چل کر برطانوی سیاست میں بڑا نام پیدا کیا۔ ہیرو کے پبلک اسکول میں تعلیم کے دوران مارماڈیوک کو لکھنے کا شوق پیدا ہوا جو مستقبل کے اس بڑے ادیب کو غالباً اپنے نانا اوبرائن سے ورثے میں ملا تھا جس نے اپنی بحری جنگی مہارت اور جنگِ نپولین کے دوران اپنی قید سے فرار کی سنسنی خیز داستان دو جلدوں میں بیان کی تھی۔

ثانوی تعلیم کی تکمیل کے بعد مارماڈیوک فرانس چلے گئے جہاں انھوں نے فرانسیسی زبان سیکھی۔ اور پھر اٹلی کے شہر فلورنس سے اطالوی زبان پر دسترس حاصل کی۔ پھر واپس لندن آ کر جرمن اور ہسپانوی زبانوں پر عبور حاصل کیا۔ اس کے ساتھ انہیں ادب اور تاریخ سے بھی گہرا شوق تھا۔ اس حوالے سے انھوں نے مشرقی زندگی اور معاشرتی روایات سے بھی اچھی خاصی شناسائی حاصل کر لی اور اس کے گہرے اثرات قبول کیے۔

تعلیم سے فارغ ہو کر مارماڈیوک انیس سال کی عمر میں امور خارجہ کے امتحان میں شریک ہوئے لیکن اس امتحان میں پہلے نمبر پر آنے کے باوجود انہیں نامعلوم وجوہات کی بنا پر ملازمت نہ دی گئی۔ جس سے وہ بے حد بددل ہوئے۔ اس زمانے کے تاثرات وہ یوں بیان کرتے ہیں۔

''میں بے حد مایوس تھا۔ مہینوں میری امیدیں لندن کے اضمحلال آگیں' یکسانیت گزیدہ اور کہر آلود ماحول سے دُور گرم ممالک اور پرانی تہذیبوں کے مراکز سے وابستہ رہیں۔ اور مجھے یہ ماحول ایک ڈراؤنا خواب لگتا تھا جب اس سے نکل بھاگنے کا

امکان مایوسی میں ڈھل جاتا۔ میں مشرق کی دھوپ' اونٹوں کی قطاروں اور کھجور کے درختوں کے خواب دیکھتا تھا۔ جیسے وہ جنت ہے اور میں نے وہ جنت اپنی کوتاہیوں سے کھودی ہے۔ اس وقت میری سرمستی دیدنی تھی جب میری والدہ نے میرے لیے مشرق کے سفر کو مناسب و بہتر سمجھا کہ اس کے لیے میری آرزوؤں میں ایک قدرتی جذبہ کارفرما تھا۔ اور اس سے میری والدہ کو پوری ہمدردی تھی''۔

اگرچہ ان کے عزیزوں کی طرف سے آکسفورڈ یونیورسٹی میں داخلہ لینے کی تجویز بھی تھی مگر انھوں نے سیاحتِ مشرق کو ترجیح دی اور اپنے ایک دوست ڈولنگ کے ساتھ مصر پہنچ گئے۔

مصر پہنچ کر مارماڈیوک نے وہاں کی تہذیب و ثقافت کا مطالعہ شروع کیا۔ اور کچھ عرصہ قیام کے بعد شام چلے گئے۔ وہاں وہ ایک پادری ہینور سے ملے جو آثار قدیمہ کا مطالعہ کر رہا تھا۔ انھوں نے اس پادری سے دوستانہ روابط استوار کر لیے اور اس سے عربی زبان سیکھنی شروع کی۔ پھر وہ ایک ترجمان اور گائیڈ کو لے کر صحرا عبور کر کے شہران' رملہ اور غزہ پہنچے۔ اس دوران ان کی ملاقات ترکی زبان کے ایک ترجمان سلیمان سے ہوئی۔ جس نے ان کی خواہش کی تکمیل میں بڑی مدد کی۔ بقول مارماڈیوک:

''ہم گھوڑے پر سوار ہو کر نکل جاتے' شہران کے میدانوں میں کسانوں کے درمیان گھومتے پھرتے رملہ' لدّ اور غزہ کے قہوہ خانوں میں بیٹھتے' ہر طرح کے لوگوں سے ملتے' اور بغیر کسی خاص سعی کے عربی زبان سیکھتے۔ اکثر ترکی حماموں میں جاتے۔ مقامی باشندوں کے گھروں میں جا کر مقامی کھانے کھاتے۔ ہر معاملے میں وہاں کے معاشرتی رسوم و رواج کا اتباع کرتے۔ حیرت ہے کہ مجھے اس زندگی میں بڑا ہی سکون ملا۔ یورپ میں رہتے ہوئے میں نے کسی شخص کو سچی خوشی سے ہم کنار نہیں دیکھا۔ لیکن عرب لوگ مجھے بے حد خوش اور مطمئن نظر آئے۔ ان کی زندگی سادہ تھی اور فطرت کی آغوش میں وہ مطمئن زندگی گزارتے تھے۔ حالانکہ اکثر عرب ممالک مغربی اقوام کے غلام تھے۔ اور یہ اقوام ان پر بہت برے طریقے سے حکومت کرتی تھیں۔ اہل یورپ کو

یہاں حکومت کرتے دیکھ کر اس کا اندازہ ہوا کہ انسان، انسان کا کس طرح دشمن ہوا کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یورپی قوموں نے اپنے مفادات کے لیے ان معصوم انسانوں کا خوب استحصال کیا''۔

ان کی آئندہ نشوونما میں فیصلہ کن ثابت ہونے والے ان تاثرات کی داستان انھوں نے اپنی کتاب ''اورینٹل اینکاؤنٹر'' میں تفصیل سے بیان کی ہے۔ اس وقت سے واپسی تک مشرقیت ان کی زندگی پر پوری طرح سے چھائی رہی۔ اسی ماحول میں انھوں نے اپنا پہلا ناول ''سعید دی فشر مین'' (سعید ایک ماہی گیر) لکھا۔ جسے یورپ کے بیشتر ناشرین نے چھاپنے سے انکار کر دیا۔ البتہ میسرز میوتھن نے اسے شائع کیا۔ اس کے چودہ ایڈیشن شائع ہوئے۔ پھر فرانسیسی جرمن اور دیگر یورپی زبانوں میں بھی اس کے ترجمے ہوئے۔

مشرقِ اوسط کی سیاحت کے بعد مارماڈیوک برطانیہ واپس چلے آئے اور کئی سال لندن، سفوک اور سوئٹزرلینڈ میں مقیم رہے۔ اس دوران پڑھنا اور غوروفکر کرنا ان کے محبوب مشاغل رہے۔ مگر ان کی بے اطمینانی بڑھتی جا رہی تھی۔ اور یورپ کا ماحول انھیں سچا سکون اور اطمینان فراہم کرنے سے قاصر تھا۔ اسی دوران برطانوی سفیر لارڈ کرومر نے انھیں مصر بلوا لیا تا کہ اہل مصر کی نفسیات کے سلسلے میں ان سے راہنمائی حاصل کرے۔ یہ وہ دور تھا جب مصر میں سخت بے اطمینانی پھیلی ہوئی تھی۔ اگرچہ برطانوی سامراج پورے عروج پر تھا، مصر کے لوگ اس کی قاہرانہ سطوت کو خاطر میں لائے بغیر بغاوتوں اور شورشوں میں مصروف رہتے تھے۔

۱۹۰۴ء میں مارماڈیوک مصر جا پہنچے۔ ان کی وہاں آمد سے وہاں کے لوگوں میں یہ افواہ پھیل گئی کہ وہ برطانیہ کے محکمۂ خفیہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ حالانکہ اس کا حقیقت سے دور کا واسطہ بھی نہ تھا۔ اس کے باوجود کہ وہ ایک ادارے کے ملازم تھا انھوں نے اپنے اخراجات خود برداشت کیے۔ انھوں نے مصر کے تعلیمی اداروں کے دورے کیے۔ جس سے ان پر مصر کی معاشرت کے نئے گوشے وا ہوئے۔ اپنے ان تجربات اور مشاہدات پر مبنی انھوں نے دو کتابیں شائع کیں۔ ایک ''دی چلڈرن آف دی نائل''

(دریائے نیل کے بیٹے) اور ''دی ویلڈ وومن'' (نقاب پوش عورت)

مصر سے پکتھال اپنی اہلیہ کے ساتھ بیروت گئے۔ وہاں سے شام پہنچے۔ پھر انھوں نے بیت المقدس میں کافی عرصہ تک قیام کیا۔ اس قیام میں انھوں نے اپنی عربی کی تحصیل مکمل کی اور اسلام کا گہرا مطالعہ کیا۔ اور مشہور علماء سے طویل ملاقاتیں کیں۔ اس زمانے میں وہ اسلام سے اس قدر متاثر ہو چکے تھے کہ مسجد اقصیٰ میں شیخ الجامعہ سے عربی پڑھتے پڑھتے انھوں نے قبول اسلام کا ارادہ ظاہر کیا۔ شیخ معمر تھے اور جہاندیدہ بھی۔ انھوں نے اس خیال سے کہ یہ ایک نوعمر شخص کا جذباتی فیصلہ نہ ہو انھیں مشورہ دیا کہ وہ قبولِ اسلام سے پہلے اپنے والدین سے مشورہ کریں اور خوب سوچ سمجھ لیں۔ پکتھال لکھتے ہیں: ''اس مشورے نے میرے دل پر عجیب اثر کیا۔ میں تو عام یورپیوں کی طرح یہ سمجھے بیٹھا تھا کہ مسلمان دوسرے مذاہب کے لوگوں کو زبردستی مسلمان بنانے پر تلے رہتے ہیں۔ مگر اس گفتگو نے میری رائے بدل دی۔ اور میں یہ سمجھنے پر مجبور ہو گیا کہ مسلمان تو بڑے روادار اور حقیقت پسند ہیں۔ ان پر متعصب ہونے کا الزام بے بنیاد ہی لگایا جاتا ہے''۔

یہ وہ زمانہ تھا جب خلافتِ عثمانیہ میں اندرونی خلفشار پیدا ہو رہا تھا اور یورپی طاقتیں خلافت کی قوت کی توڑنا چاہتی تھیں۔ جنگ طرابلس اور جنگ بلقان میں خلافتِ عثمانیہ کو شکست ہو چکی تھی۔ پکتھال کا خیال تھا کہ یورپی طاقتیں محض مذہبی تعصب اور اسلام دشمنی کے سبب خلافت عثمانیہ کے ٹکڑے کرنا چاہتی ہیں۔ ۱۹۱۲ء میں وہ مشرق اوسط سے واپس انگلستان گئے اور اینگلو عثمانیہ سوسائٹی قائم کی۔ اس سوسائٹی کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ ترکوں کے خلاف جو زیادتیاں ہو رہی ہیں ان کا تدارک ہو۔ مگر شدید مخالفانہ اور متعصّبانہ فضا میں یہ کوشش کامیاب نہ ہو سکی اور غیر معمولی ذہنی دباؤ کے سبب پکتھال بیمار پڑ گئے۔

پکتھال لکھتے ہیں: ''فروری ۱۹۱۳ء میں' میں نے چند ماہ کے لیے ترکی جانے کا فیصلہ کیا تاکہ اس فضا سے نجات پا سکوں۔ جس نے مجھے بیمار کر دیا تھا۔ بیسویں صدی

کے ان ایام میں برطانوی اخبارات اور عوام، ترکوں کے خلاف اس صلیبی جنگ کے نعروں کی پُر جوش حمایت کر رہے تھے جو بعض عیار بلقانی حکمرانوں نے بلند کیے تھے۔ اور میرے خیال میں برطانوی سیاست دانوں نے اپنے ملک کے مفادات کے لیے نہیں بلکہ اپنے حریف روس کے مفادات کے لیے اس مذہبی جوش و جنون کو ہوا دی۔ ایک مسلم طاقت کے خلاف عیسائیوں کے اس اتحاد اور یک جہتی کو بہت سے لوگوں نے سراہا۔ لیکن اس سے ان انگریزوں کے دل ٹوٹ گئے جو مشرق سے پیار کرتے تھے۔ اس وقت مجھے یوں لگا جیسے عیسائیت دو طرح کی ہے۔ ایک وہ جس کے خیر اندیشیاں اور فیض رسانیاں صرف عیسائی اقوام تک محدود ہیں۔ اور دوسری جو ساری دُنیا کو بلا لحاظ مذہب رنگ و نسل عدل و انصاف اور سخاوت کا مستحق سمجھنے کی دعوے دار ہے۔ مگر روس انگلستان اور بلقانی ریاستوں میں پہلی قسم کی عیسائیت کا دور دورہ تھا۔ یہ مذہبی جنون اور تعصب و تنگ نظری کی وہی کیفیت تھی جو اگر کم علم جاہل مسلمانوں میں پیدا ہوتی ہے تو ہم اس کی مذمت کرتے نہیں تھکتے۔ مگر خود بار بار اس کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ یہ ثانی الذکر جذبہ ہماری مشرقی سلطنت میں کارفرما ہوا۔ انسانیت اور رواداری کا جذبہ جسے جدید زندگی سے وابستہ کیا جاتا ہے۔ اگر ہم ثانی الذکر عیسائیت کو رد کرتے اور اول الذکر کو اپناتے تو مشرق کے تعلیم یافتہ لوگ جو قدم قدم پر ہمارے رویے پر نظر رکھے ہوئے تھے، ہمیں جھوٹا کہتے۔ یورپ سے قریبی تعلق رکھنے والا ملک ترکی مشرق میں ترقی پسندانہ تحریکوں کا سربراہ تھا۔ اور اگر سربراہ منتخب کیا جاتا تو وہ انتہائی باشعور ثابت ہوتا۔ ترک یورپ کو سمجھنے اور اپنے پیروکاروں کی ترجمانی کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ لہٰذا میں ایک ترک کے زاویۂ نگاہ سے ترکی کے حالات و احوال کی تفتیش کے لیے ترکی روانہ ہو گیا''۔

پکتھال ترکوں سے پہلے ہی متاثر تھے۔ مگر اب انھیں کئی ماہ تک یکسوئی کے ساتھ وہاں قیام کا موقع ملا۔ تو ترکوں کی سماجی خوبیوں اور طبعی خصوصیات نے انھیں مکمل طور پر اپنا اسیر بنا لیا۔ چنانچہ غازی طلعت بے اور دوسرے ترک راہنماؤں کا ذکر وہ یوں کرتے ہیں:

''ایک دن میں نے طلعت سے کہا: آپ یونہی غیر مسلح پھرتے رہتے ہیں۔ آپ

کو اپنے ساتھ مسلح محافظ ضرور رکھنے چاہییں۔ جواب میں انھوں نے کہا اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر میرا کوئی محافظ نہیں۔ مجھے اس پر اعتماد ہے۔ اور موت کا ایک وقت مقرر ہے۔ اور اسلام کی یہی تعلیم ہے''۔

پکتھال غازی انور پاشا، شوکت پاشا، روف پاشا، اور دوسرے ترک راہنماؤں کا ذکر بھی بڑی عقیدت اور والہانہ محبت کے ساتھ کیا کرتے تھے۔ ان کا تاثر تھا کہ لوگ ناحق ترکوں پر آزاد خیالی اور لادینی کا الزام دھرتے ہیں، میں نے تو انھیں ہمیشہ ایک سچا مسلمان پایا۔

قیام ترکی کے دوران پکتھال نے قبول اسلام کا مصمم ارادہ کر لیا۔ چنانچہ انھوں نے غازی طلعت بے سے کہا: ''میں مسلمان ہونا چاہتا ہوں''۔ اس پر انھوں نے جواب دیا: ''آپ قسطنطنیہ میں اپنے قبولِ اسلام کا اعلان نہ کیجیے۔ بہتر ہے کہ اس کا اعلان لندن سے ہو۔ یورپ میں اس کے تبلیغی نتائج زبردست رہیں گے''۔

اسی کے نتیجے میں پکتھال نے لندن جا کر دسمبر ۱۹۱۴ء میں اپنے قبولِ اسلام کا اعلان کر دیا۔ جس سے وہاں کی علمی اور سیاسی دُنیا میں ہلچل مچ گئی۔ عیسائی دُنیا کا عمومی تبصرہ تھا: ''جس مذہب کو پکتھال جیسا شخص قبول کرتا ہے اس میں یقیناً بہت سی خوبیاں ہوں گی''۔

قبولِ اسلام کے موقع پر پکتھال کے تاثرات تھے: ''میں اپنے زورِ مطالعہ سے مسلمان ہوا ہوں اس لیے میرے دل میں اس کی بے حد قدر ہے۔ مسلمانوں کو اسلام ورثے میں ملا ہے اس لیے وہ اس کی قدر نہیں جانتے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام امن و عافیت کا گہوارا ہے۔ اور اس نعمت پر میں خدائے بزرگ و برتر کا جس قدر شکر ادا کروں کم ہے''۔

انگلستان میں رہتے ہوئے پکتھال نے اپنی تحقیق کے نتائج ایک سلسلہ مضامین کی شکل میں ''دی نیو ایج'' میں شائع کروائے۔ نیز ''ترک ان دی وار ٹائم'' کے نام سے اپنے قیامِ استنبول کے دوران کے تجربات شائع کیے۔ ان تمام تحریروں میں انھوں نے کوشش کی تھی کہ برطانیہ کو ترکی کے بارے میں معاندانہ رویہ ترک کر دینا چاہیے۔

برطانیہ کو روس کی حمایت سے دست کش ہو جانا چاہیے۔ جنگ عظیم کے دوران انھوں نے کوشش کی کہ برطانیہ اور ترکی کی مابین صلح ہو جائے۔ مگر افسوس انگریزوں کے غرور و تعصب نے ان کی یہ کوششیں بار آور نہ ہونے دیں۔ جنگ ختم ہونے کے بعد انھوں نے ترکی میں خلافت کی بقاء کی جدوجہد میں نمایاں کردار ادا کیا۔ قیامِ امن کے لیے ایک ایسے تصفیئے کے لیے کوششیں کیں جو فاتح طاقتوں کی بجائے ترکی مفاد میں زیادہ تھا۔ ترکوں سے پکتھال کی ہمدردی مذہبی نوعیت کی تھی۔ چنانچہ جب مصطفیٰ کمال نے ترکی میں خلافت کا خاتمہ کر دیا تو ترکی کے ساتھ پکتھال کی دلچسپیاں مدہم پڑ گئیں۔

جنگ عظیم کے دوران پکتھال لندن میں تبلیغِ اسلام کا فریضہ انجام دیتے رہے۔ وہ جمعہ کا خطبہ دیتے' امامت کراتے' عیدین پڑھاتے اور نماز میں تراویح کے امام ہوتے۔ رسالہ ''اسلامک ریویو'' کی ترتیب و تدوین بھی انھی کے سپرد تھی۔ اس دوران وہ ''ادارہ معلومات اسلامی'' سے بھی منسلک رہے۔ ترکی کے حق میں متعدد مضامین کے علاوہ ان کی تین کتابیں شائع ہوئیں۔ یعنی ''ٹیلز فرام فائیو چمنیز (۱۹۱۵ء) ''دی ہاؤس آف وار'' (۱۹۱۶ء) اور ''نائیٹس آ واعرابی'' (۱۹۱۷ء)۔

۱۹۲۰ء میں عمر سبحانی کی دعوت پر پکتھال بمبئ آ گئے۔ اور وہاں کے مشہور اخبار ''بمبئ کرانکل'' کی ادارت سنبھال لی۔ اور ۱۹۲۵ء تک یہ ذمہ داری نبھاتے رہے۔ انھوں نے بے شمار اداریوں میں یہ بات کھل کر لکھی کہ عیسائی دُنیا کا خلافتِ عثمانیہ کی تباہی میں کیا کردار تھا۔ اور یہ کہ عالم اسلام کے خلاف انگریز کس انداز کی سازشوں میں معروف ہیں۔ غرض اس دوران انھوں نے ہندستانی مسلمانوں اور ترکوں کے مسائل میں گہری دلچسپی لی۔ ہندستان کی سیاست میں جزوی طور پر حصہ لیا۔ اور ناگپور اور بڑوچ میں کانگریس کے اجلاس میں شرکت کی۔ اس دوران انھوں نے دو کہانیاں ''دی سٹوڈنٹ اینڈ دی ٹاور'' اور ''دی کوسٹ'' لکھیں۔ اور ایک انسائیکلوپیڈیا کے لیے بمبئ اور گجرات کے بارے میں دو بھرپور مقالے بھی تحریر کیے۔

۱۹۲۴ء میں انھوں نے ''بمبئ کرانیکل'' کی ادارت ترک کر دی۔ اور مغربی

گھاٹ میں کچھ دن آرام کرنے کے لیے چلے گئے۔ یہیں انھیں نظام حیدر آباد کی جانب سے دکن کے وزیراعظم سر اکبر حیدری اور ناظم تعلیمات سر راس مسعود کے خطوط ملے جن میں اس خواہش کا اظہار کیا گیا تھا کہ پکتھال اپنی خدمات حیدر آباد دکن کے سپرد کردیں۔ چنانچہ انھوں نے نظام کے حکم پر چادر گھاٹ کالج کی پرنسپلی قبول کر لی۔ اور یکم جنوری ۱۹۲۵ء کو نئی ذمہ داریاں سنبھال لیں۔ پکتھال حیدر آباد دکن کے ماحول اور معاشرت سے بے حد متاثر ہوئے۔ وہ اپنے ایک دوست کو لکھتے ہیں: ''حیدر آباد ایک شان دار جگہ ہے۔ ناقابل بیان حد تک خوبصورت۔ یہ آفتاب مغلیہ کی ایک جگمگاتی کرن ہے۔ تہذیب و ثقافت میں اس کی کوئی مثال نہیں۔ دکن اور اس کی تہذیب سے پکتھال کی محبت عمر بھر قائم رہی۔ انھوں نے چادر گھاٹ کالج کو ترقی دینے کے لیے بڑی جانفشانی سے محنت کی۔ طلباء کی کردار نگاری کے لیے خصوصی انتظامات کیے۔ اور بہت جلد اسے ایک مثالی ادارہ بنا دیا۔ ان خدمات کی قدر کرتے ہوئے نظام نے انھیں ریاست کے سول سروس ہاؤس کا منتظم اعلیٰ بنا دیا۔ اس ادارے میں حیدر آباد سول سروس کے تمام اعلیٰ عہدیدار تعلیم و تربیت حاصل کرتے تھے۔

۱۹۲۶ء میں پکتھال نے نیلی چرنی میں منعقد ہونے والی پہلی موپلا ایجوکیشنل کانفرنس کی صدارت کی۔ انھیں اس جماعت سے وابستگی پر از حد مسرت ہوئی۔ اس سلسلے میں انھوں نے اپنے ایک دوست سید ہاشمی کو لکھا: ''میرے خیال میں نیلی چرنی کا اجلاس بڑا کامیاب رہا۔ انھوں نے میرا استقبال انتہائی گرمجوشی اور میری توقعات سے بڑھ کر خلوص اور محبت کے ساتھ کیا۔ ان کی مہمان نوازی محبت اور خلوص اس کا واضح ثبوت ہے کہ وہ واقعی عربی النسل ہیں۔ موپلوں کو دیکھ کر مجھے سب سے پہلے جس بات کا احساس ہوا وہ فروغ اسلام کا ہے۔ وہ سیدھے سادے مخلص اور فعال مسلمان ہیں۔ میں نے نیلی چرنی میں نمازیں ادا کی ہیں۔ ساری مسجدیں ہندوؤں کے مندروں جیسی بنی ہوئی ہیں۔ اور وہابیوں کی طرح یہاں بھی زمین پر کھڑے ہو کر اذان دی جاتی ہے۔ جب میں نے بتایا تو اصلاحی جماعت والے بے حد حیران ہوئے۔ کیونکہ مالا بار کے مولوی وہابیت سے

بہت دُور ہیں۔ میں نے نماز کے وقت اجلاس کی کاروائی روک دی۔ ہر شخص نماز پڑھنے چلا گیا۔ میں نے نوجوان لیڈروں کو یہ احساس دلایا کہ فضول قسم کے رسوم و رواج سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کی جارہی ہو تو اسلام کے ناگزیر اصولوں اور ضوابط کی سختی سے پابندی کرنا ضروری ہے''۔

۱۹۲۷ء میں پکتھال نے حیدر آباد سے ایک سہ ماہی انگریزی رسالے ''اسلامک کلچر'' کا اجراء کیا جس کا انتظام و انصرام ایک بورڈ کے سپرد تھا۔ اس کے سربراہ سر اکبر حیدری تھے۔ اس رسالے میں علمی اور تحقیقی نوعیت کے مضامین شائع ہوتے تھے۔ جن میں اسلامی تعلیمات کا اثبات دلائل و براہین کے ساتھ کیا جاتا تھا۔ انھوں نے اس رسالے کو ہندستان میں اپنی نوعیت کا واحد پرچہ بنانے کے لیے بے حد محنت کی۔ ایک ایسا علمی جریدہ جو ہر پہلو سے اسلامی ثقافت اور روایات کا آئینہ دار ہو۔ اپنے عہد ادارت میں انھوں نے متعدد مستشرقین کو اس رسالے میں لکھنے پر آمادہ کیا۔ اور دُنیا بھر کی تقریباً ستر یونیورسٹیاں اس کے خریداروں میں شامل ہوگئیں۔ اشاعت کے لیے آنے والے اکثر مضامین کو وہ دوبارہ لکھتے۔ اور رسالے کے اعلیٰ معیار کو کسی صورت میں بھی کمزور نہ ہونے دیتے۔ اس رسالے کی انگریزی بے حد بلند معیار کی تھی۔ چونکہ پکتھال دُنیا کی بہت سے زبانیں جانتے تھے۔ اس لیے وہ غیر ملکی فضلا کے مضامین کے تراجم نہایت خوش اسلوبی سے کر لیتے تھے۔ تازہ ترین کتابوں پر تبصرہ بھی خود ہی کرتے تھے۔ یوں انگریزی خواں طبقہ دُنیا بھر میں اسلام اور مسلمانوں کے حوالے سے چھپنے والی ہر کتاب سے باخبر رہتا تھا۔

۱۹۲۷ء میں پکتھال نے مدارس میں مختلف اسلامی موضوعات پر متعدد لیکچر دیے۔ سالانہ لیکچروں کا یہ اہتمام اس شہر کے ایک علم دوست اور دیندار تاجر دوست جمال محمد کرتے تھے۔ اور ان میں مختلف مشاہیر اپنے رشحاتِ فکر پیش کرتے تھے۔ ان لیکچروں کے موضوعات میں اسلامی تہذیب و ثقافت کے مختلف پہلو شامل تھے۔ جو بعد میں ''کلچرل سائیڈ آف اسلام'' کے عنوان سے کتابی صورت میں شائع ہوئے۔ تعلیم یافتہ

سنجیدہ طبقے میں یہ لیکچر بہت پسند کیے گئے۔

لیکن پکتھال کی علمی و ادبی زندگی کا سب سے بڑا اور سب سے شاندار کارنامہ ان کا ترجمۂ قرآن ہے۔ وہ حالات جو اس مقتدر و مقدس کام کے موجب بنے مختصراً یوں ہیں کہ مارچ ۱۹۱۹ء میں ووکنگ مسلم مشن کے انچارج خواجہ کمال الدین کو سخت علالت کی حالت میں ڈاکٹروں کی ہدایت کے مطابق لندن چھوڑ کر ہندستان آنا پڑا۔ ان کی عدم موجودگی میں پکتھال نے ووکنگ مسجد کے امام کے فرائض سنبھال لیے اور جمعہ اور عیدین کی نمازیں پڑھائیں۔ ''اسلامک ریویو'' مرتب کیا۔ اور لندن پریز ہاؤس میں خطبے دیے۔ تقریریں کیں۔ ان مولویانہ فرائض کی انجام دہی کے دوران انہیں اپنے انگریز سامعین کے سامنے قرآنی آیات پڑھنی اور ان کا ترجمہ کرنا پڑتا تھا۔ وہ کتابِ مقدس کے مروجہ ترجموں سے مطمئن نہ تھے۔ اکثر مواقع پر وہ اصل عربی متن کو اپنے انداز میں بیان کرنے پر مجبور ہو جاتے۔ آخر وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ عیسائی مترجموں کے کئے ہوئے تراجم انتہائی ناقابل اعتبار اور ناقابل قبول ہیں کہ ان کا رویہ متعصّبانہ اور معاندانہ تھا۔ وہ قرآن پاک کے مطالب سے صحیح طور پر انصاف نہیں کر سکے۔ چنانچہ ضرورت اس امر کی تھی کہ کوئی راسخ العقیدہ مسلمان ترجمے کا فریضہ انجام دے۔ ان کے دل میں خود یہ عظیم کام انجام دینے کی تڑپ پیدا ہوگئی۔ مگر اس کام کو عملی جامہ پہنانے کے لیے انھیں کئی سال انتظار کرنا پڑا۔

ریاست حیدر آباد دکن میں ملازمت کے دوران پکتھال نے ترجمۂ قرآن کے عظیم الشان کام کا ارادہ ظاہر کیا۔ اس کی اطلاع جب نظام کو ملی تو انھوں نے انہیں پوری تنخواہ کے ساتھ دو سال کی رخصت عطا فرمائی تا کہ کامل توجہ اور یکسوئی کے ساتھ اپنا کام کر سکیں۔ چنانچہ پکتھال ہمہ تن قرآن پاک کے ترجمہ کرنے کے کام میں منہمک ہو گئے۔ جب ترجمہ مکمل ہو گیا تو نظام نے انھیں اپنے خرچ پر مصر بھیجا تا کہ علمائے ازہر سے ضروری معاملات پر مشورہ لیا جا سکے۔ چنانچہ پکتھال اپنا مسودہ لے کر مصر جا پہنچے۔ اور قاہرہ میں کئی مہینے محمد احمد الغم الرادی اور جامعہ الازہر کے ڈائریکٹر شیخ مصطفیٰ المراغی کے

تعاون و امداد سے اس پر نظر ثانی میں صرف کیے۔ اس کے علاوہ بھی انھوں نے کئی عرب علماء وفضلاء سے قرآن حکیم کے مشکل مقامات پر بحث مباحثہ کیا۔ اور اشکال حل کیں۔ بالآخرتین سال کی یہ محنت شاقہ رنگ لائی۔ اور ۱۹۳۰ء میں یہ ترجمہ ''دی گلوریس قرآن'' کے نام سے بیک وقت لندن اور نیویارک سے شائع ہوا۔ یہ نسخہ دو جلدوں میں حیدر آباد دکن سے بھی شائع ہوا۔ اس کے جملہ اخراجات نظام حیدر آباد نے ادا کیے۔ بعدازاں اس کے دولسانی ایڈیشن بھی شائع ہوئے۔ جس میں عربی متن اور انگریزی ترجمہ پہلو بہ پہلو چھاپے گئے تھے۔ ہر نسخہ دو جلدوں میں گورنمنٹ سنٹرل پریس حیدر آباد دکن سے شائع کیا گیا۔ اس کی طباعت و اشاعت کا مشکل کام والئی ریاست نظام دکن کی خسروانہ سرپرستی سے آسان ہو گیا۔ یہ نسخہ جس میں اصل عربی بھی شامل ہے مسلمان قاریوں کے لیے زیادہ مفید ہے۔

محمد مارماڈیوک پکتھال ترجمۂ قرآن کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

''اس ترجمے کا مقصد انگریزی خوان طبقے کے سامنے یہ پیش کرنا ہے کہ دُنیا بھر کے مسلمان قرآن کے الفاظ سے کیا مفہوم لیتے ہیں۔ اس کا مقصد قرآن کی ماہیت کو موزوں الفاظ میں سمجھانا اور انگریزی بولنے والے مسلمانوں کی ضرورت کو پورا کرنا ہے۔ یہ دعویٰ بڑی سنجیدگی کے ساتھ کیا جا سکتا ہے کہ کسی الہامی کتاب کو کوئی ایسا شخص ایسی عمدگی سے پیش نہیں کر سکتا جو اس کے الہامات اور پیغام پر ایمان نہ رکھتا ہو۔ یہ پہلا ترجمہ ہے جو ایک ایسے انگریز نے کیا ہے جو مسلمان ہے۔ جبکہ بعض تراجم میں ایسی تعبیریں کی گئی ہیں جو مسلمانوں کے لیے دل آزار ہیں۔ اور تقریباً سب میں زبان کا ایسا اسلوب اختیار کیا گیا ہے جسے مسلمان غیر موزوں سمجھتے ہیں۔ یہ قدیم علما کا بلکہ میرا بھی عقیدہ ہے کہ قرآن کا ترجمہ ناممکن ہے۔ میں نے اس کتاب کو علمی انداز میں پیش کیا ہے اور اس کے لیے کوشش کی ہے کہ موزوں زبان استعمال کی جائے۔ لیکن بہرحال یہ ترجمہ قرآن مجید نہیں ہو سکتا۔ کہ قرآن تو بے مثل و بے عدیل ہے۔ قرآن میں اتنی ہم آہنگی ہے کہ لوگ اسے سنتے ہی رونے لگتے ہیں اور وجد میں آ جاتے ہیں۔ یہ تو قرآن کے مفہوم کو انگریزی زبان میں

پیش کرنے کی محض ایک کوشش ہے۔ اور اس کے سحر کی قدرے عکاسی کی گئی ہے۔ یہ عربی زبان کی جگہ نہیں لے سکتا۔ اور نہ ہی میرا یہ مقصد ہے''۔

چنانچہ یہ پہلا انگریزی ترجمہ قرآن ہے جس میں انجیل کے سے ترجمے کا لطف آتا ہے۔ اور نہ صرف صحت' سلاست' اور فصاحت کے اعتبار سے مقبول ترین ہے بلکہ پرشکوہ اور بے پناہ اثر آفرین ہے۔ محترم مریم جمیلہ نے اس ترجمے کو یوں خراج تحسین پیش کیا ہے:

''مجھے اس کے مقابلے کا کوئی انگریزی ترجمہ نہ مل سکا۔ کسی ترجمے میں وہ فصاحت و بلاغت اور دل نشین اندازِ بیان نہیں جو اس میں موجود ہے۔ بہت سے دوسرے تراجم میں اللہ کے لیے ''گاڈ'' کا لفظ استعمال کرنے کی غلطی کی گئی ہے۔ لیکن پکتھال نے ہر جگہ ''اللہ'' ہی کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اس سے اسلام کے پیغام میں مغرب کے قاری کے لیے بڑی تاثیر پیدا ہوگئی ہے''۔

بہرحال پکتھال کی ان عظیم دینی اور علمی خدمات کو سارے عالم اسلام میں سراہا گیا۔ اور نظام دکن نے انھیں پہلی گول میز کانفرنس میں سلطنتِ آصفیہ دکن کے وفد کا سیکرٹری نامزد کیا۔

جنوری ۱۹۳۵ء میں محمد مارماڈیوک پکتھال حیدر آباد دکن ایجوکیشن سروس سے مستعفی ہو گئے۔ اور لندن واپس چلے گئے۔ حکومت حیدر آباد نے ان کی تاحیات پنشن مقرر کر دی۔ لندن جا کر پکتھال ہمہ تن اسلام کی خدمت میں مصروف ہو گئے۔ ''اسلامک کلچر'' جو پہلے حیدر آباد سے چھپتا تھا۔ اب لندن سے چھپنے لگا۔ رائل سنٹرل ایشین سوسائٹی لندن کی طرف سے ان کے سلسلہ وار مضامین ''جدید دُنیا میں مسلمانوں کا کردار'' بھی شائع ہونے لگے۔

اسی طرح بقیہ حیاتِ مستعار کا ایک ایک لمحہ دین حق کی تبلیغ و اشاعت میں صرف کرتے ہوئے یہ عظیم الشان انسان' عالم بے مثل' مفکر و مبلغ ۱۹ مئی ۱۹۳۶ء کی صبح حرکت قلب بند ہونے سے انتقال کر گیا۔ ۱۸ مئی کی رات سونے سے پہلے انھوں نے ایک کاغذ پر قرآن پاک کی یہ آیت اور اس کا انگریزی ترجمہ تحریر کیا:

بَلٰی ق مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗۤ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ٥ (البقرہ ۲:۱۱۲)

حق یہ ہے کہ جو بھی اپنی ہستی کو اللہ کی اطاعت میں سونپ دے اور عملاً نیک روش پر چلے' اس کے لیے اس کے رب کے پاس اس کا اجر ہے۔ اور ایسے لوگوں کے لیے رنج وخوف کا کوئی موقع نہیں۔

گویا اللہ تعالٰی نے دُنیا ہی میں پکتھال کو کامیابی اور خوشنودی کا مژدہ سنایا ہے۔ یہ نصیب اللہ اکبر! انھیں لندن میں مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کیا گیا۔ اگر چہ ان کی دیرینہ خواہش تھی کہ ان کی موت ہسپانیہ میں ہو۔ وہاں کے اسلامی دور سے انھیں بے حد محبت تھی۔

پکتھال یورپی ہونے کا باوجود مکمل طور پر اسلامی اخلاق سے آراستہ تھے۔ پنج گانہ نمازوں اور رمضان کے روزوں میں کبھی ناغہ نہ ہونے دیتے۔ قدم قدم پر اللہ اور رسولؐ کا ذکر کرتے۔ ان کا اللہ پر ایمان بڑا ہی مستحکم تھا۔ ہر کام اس کی رضا کے مطابق انجام دیتے۔ بے حد شریفانہ جذبات کے مالک تھے۔ حیدر آباد دکن میں قیام کے دوران غریب اور نادار طلباء کی دل کھول کر امداد کرتے رہے۔ بے تعصب' بے ریا انسان تھے۔ ان سے ملنے والے ایمان میں تازگی محسوس کرتے تھے۔ مشہور مصنف شیخ عطا اللہ لکھتے ہیں:

مجھے علی گڑھ میں ان کے چند شاگردوں سے ملاقات کا موقع میسر آیا۔ ان میں مسلمان بھی تھے اور ہندو بھی۔ لیکن ہر ایک ان کے خلوص اور ان کی پدرانہ شفقت کا مداح نظر آیا۔

اللہ تعالٰی کی قدرت کے کھیل نیارے ہوا کرتے ہیں۔ جہاں مسلمانوں کو اپنے دین اسلام کی خدمت کی توفیق یا اس کی سر بلندی کی فکر نہیں ہوتی وہاں مارماڈیوک ولیم پکتھال جیسے لوگ مسلمان بن کر اسلام اور مسلمانوں کی وہ خدمت کر جاتے ہیں کہ ان کے یہ کارنامے ابد الآباد تک تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہو جاتے ہیں۔

خطبۂ اول

اسلامی تہذیب

تہذیب سے مراد انسانی دل و دماغ کی آرائش ہے۔ اسلامی تہذیب کا مقصد کسی ایک فرد یا کسی خاص قوم کی نہیں بلکہ تمام بنی نوعِ انسان کی آراستگی ہے۔ اگر کسی ملک میں ظلم و بے انصافی کا بازار گرم ہے اور تعصب اور عدم مساوات کی لعنتیں اس پر مسلط ہیں۔ تو اس ملک میں فنون و ہنرمندی کے بہترین اور اعلیٰ ترین شاہکاروں کی بہتات اور ادبی جواہر پاروں کی فروانی اسلام کے لیے ہرگز باعث افتخار نہیں ہوسکتی نہ ہی وجۂ جواز ہوسکتی ہے۔ زمانۂ امن و جنگ کی شان دار فتوحات اور حیرت انگیز کمالات بھی ثمرِ اسلام کے طور پر پیش نہیں کیے جا سکتے۔ اسلام کے پیش نظر تو زیادہ وسیع اور بلند تر مقاصد اور زیادہ شاندار اور پر شکوہ مناظر ہیں۔ اسلام اصلاح نسل کی بھی دوسرے مذاہب کے مقابلے میں زیادہ ترغیب دیتا ہے۔ اسلام کے ظہور و اقتدار کے تہذیبی اثرات کے سامنے دُنیا کی دوسری تہذیبوں' مذاہب اور فلسفوں کے کارنامے ماند پڑ گئے ہیں۔ مغرب میں فنون و ادب کی عظمت پرستش کی حد تک پہنچی ہوئی ہے اور وہاں اسے بھی تہذیب کا ایک لازمی حصہ سمجھا جاتا ہے۔ اسے دیکھ کر ایک مسلمان حیرت زدہ رہ جاتا ہے۔ دُنیا تو آج تک یہ سمجھتی ہے کہ فنون و ادب کے کمالات ہی انسانی زندگی کا مقصد و منشا ہیں۔ مسلمان کی حیرت کی وجہ یہ نہیں کہ وہ ان ادبی' علمی اور فنی کمالات کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اس کی نظر میں تو یہ محض ضمنی فیوض ہیں۔ جن کی حیثیت مقصد تک پہنچنے کے ذرائع یا زادِ سفر جیسی ہے۔ اسلام کے تمام علمی و ادبی اور فنی ذخیروں کی

نوعیت بھی ایسی ہی ہے۔ ان میں بعض خوب صورت نظمیں، غزلیں اور فنِ تعمیر کے دل کش نمونے ضرورت اور تفریح دونوں پہلوا پنے اندر سمیٹے ہوئے ہیں۔ اسلام کے ان تمام کارناموں میں ایک راہنما' ایک ہدایت اور ایک ہی منزل مقصود پنہاں ہے۔ راہنما اور ہادی تو خود آنحضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں' رشد وہدایت کا سرچشمہ قرآن پاک اور منزلِ مقصود اللہ تعالیٰ کی ذات پاک ہے۔

اسلامی تہذیب سے میری مراد کوئی ایسی تہذیب نہیں جو مسلم قوم کو کسی بیرونی ماخذ سے حاصل ہوئی ہو۔ بلکہ اسلامی تہذیب سے مراد اسلام یعنی اس مذہب کی تعین کردہ تہذیب ہے جس کا واضح مقصد انسانی ترقی ہے۔

ہر وہ شخص جسے مطالعۂ قرآن پاک کی سعادت نصیب ہوئی ہے' تسلیم کرے گا کہ قرآن پاک میں ان لوگوں کے لیے جو اس کی تعلیمات پر عمل کرنے والے ہوں دُنیا و آخرت دونوں میں کامیابی کا وعدہ کیا گیا ہے۔ مزید برآں قرآن پاک کے پیش نظر بنی نوعِ انسان کی فلاح و کامیابی ہے جو قوائے انسانی کی بالیدگی اور انعامات الٰہی کی زیبائش و آراستگی سے حاصل ہو سکتی ہے۔ اگر مسلمانوں نے کوئی ایسا طریق زندگی یا طرزِ عمل اختیار کر لیا ہے جو قرآنی تعلیمات اور احکامات نبویؐ کے مطابق نہیں ہے تو یہ ایک غیر اسلامی رَویہ ہے جس کا سراغ اسلامی نظام کے باہر ملے گا۔ مسلمانوں کو ایسا کوئی غیر شرعی نظام قبول کر کے کامیابی و فلاح کی امید نہ رکھی چاہیے جو بظاہر ان کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ نہ بنتا ہو۔ ایسا ہر آئین جو قرآنی تعلیمات کے خلاف اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلیم و عمل کے برعکس ہو گا' مسلمانوں پر ترقی کی راہیں بند کر دے گا۔ مسلمان کے لیے کسی غیر اسلامی آئین کا قبول و اختیار کر لینا اپنے آپ کو سراسر ہلاکت و تباہی میں ڈال دینا ہے۔

اسلام نے ابتدا میں فنون کی چند صورتوں کی زمانۂ جاہلیت کے عربوں کی ان سے بت پرستانہ مناسبت اور ان کی بد اعمالیوں کی یاد کی بنا پر مخالفت کی۔ کیونکہ قوم کی ترقی کے لیے ایسے جہالت کے نشانات مٹا دینے ضروری تھے۔ لیکن بعض فنون کی مخالفت

اور بعض کی حمایت ان فنون کے نمونوں کی طرح ایک ضمنی چیز تھے۔

اسلامی تہذیب کا مدعا و منشا زندگی کے غیر اہم اور رسمی لوازمات کی تربیت نہیں بلکہ خود زندگی کی تزئین و آراستگی ہے۔ آج مغرب میں روشن خیال لوگوں کی کثیر تعداد اس خیال کی حامی چلی آتی ہے کہ اگر کسی قوم کی ایک ناقابل ذکر اکثریت فنونِ جمیلہ میں خاص دسترس رکھتی ہو تو اس چھوٹی سی اکثریت کا وجود تمام قوم کو پروانہ تہذیب دلا دینے کے لیے کافی ہے۔ خواہ اس قوم کی غالب اکثریت اپنے گھٹیا طرزِ معاشرت کی بدولت انتہائی ذلت و خواری کی زندگی بسر کرنے پر ہی مجبور کیوں نہ ہو۔ یہ روشن خیال اقلیت اس امر کی بھی قائل نظر آتی ہے کہ کسی قوم کی اقلیت کا فنونِ لطیفہ میں خاص دسترس حاصل کر لینا اس قوم کی اکثریت کے لیے ذلت و خواری کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہونے کا ایک معقول جواز ہے۔

آپ حضرات میں سے اکثر کو برطانیہ کے اخبارات کا ایک مباحثہ یاد ہوگا۔ وہ ایک معمہ تھا جو حل کرنے کے لیے دیا گیا تھا۔ ''فرض کیجئے کہ ایک کمرے میں یونانی صناعی کا ایک نادر و بے مثال مجسمہ رکھا ہے۔ اسی کمرے میں ایک بچہ بھی سو رہا ہے۔ اگر اس کمرے میں آگ لگ جاتی ہے تو ان دونوں میں سے صرف ایک ہی کو بچایا جا سکتا ہے۔ آپ کی رائے میں کسے بچانا چاہیے؟'' تو اخبارات کے قارئین کی اکثریت نے جن میں اکثر صاحبِ فہم و ادراک، تعلیم یافتہ اور روشن خیال لوگ بھی موجود تھے، جواب دیا ''بچے کو بے شک جل جانے دیا جائے لیکن مجسمے کو بچا لیا جائے''۔ اس ظالمانہ اور خودغرضانہ فیصلے کی یہ تاویل دی گئی کہ بچے تو ہر روز ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں پیدا ہوتے رہتے ہیں لیکن یونانی صناعی کے ایسے بے بدل اور نایاب مجسمے دُنیا کو دوبارہ حاصل نہیں ہو سکتے۔ مسلمان کسی ایسے بے رحمانہ اور ظالمانہ فیصلے کے بارے میں سوچنے کا خیال بھی دل میں نہیں لا سکتا۔ اس قسم کی باتوں کو عہدِ حاضر کی مہذب بت پرستی ہی کہا جا سکتا ہے۔

اسلام بنی نوعِ انسان کے لیے ایک درخشاں مستقبل پیشِ نظر رکھتا ہے اور اس

کے حصول کی سعی کرتا ہے۔ اگرچہ مسلمان اللہ کی راہ میں (یہ بھی ایک طرح کی خدمت خلق ہی ہے) اپنی جانِ دینا انتہائی معمولی سمجھتا ہے۔ لیکن فنونِ لطیفہ کے شاہپاروں کے لیے ادنیٰ سے ادنیٰ انسانی قربانی کا خیال اس کے وہم و گمان میں ہی نہیں آ سکتا۔ فنونِ لطیفہ کی پرستش اللہ تعالیٰ کی ہدایات اور تخلیق آدمؑ کے مقصد سے بے خبری اور جہالت پر مبنی ہے۔ ان لوگوں کے پیش کردہ دلائل یہ ہیں کہ یہ نادر فنی شہ پارے انسان نے صدیوں کی محنت سے پیدا کیے۔ اب جبکہ حسن و جمال نایاب ہوتا جا رہا ہے' انسانی ہنرمندی و کمالات رو بہ زوال ہیں' ہمیں پرانے وقتوں کے ان نادر و حسین فنی شاہکاروں کی حفاظت کرنی چاہیے اور انھیں خزائین بے بہا سمجھنا چاہیے۔ یہ دلائل ناامیدی اور مایوسی کا پیغام ہیں۔ اس کے برعکس اسلام امید و ہمت کی جلوہ گری کا نام ہے۔ اسلام مروجہ معنوں میں تقدیر پرستی کی تعلیم نہیں دیتا۔ اسلام یہ نہیں کہتا کہ کوئی بری یا ناگوار صورت حال تمہارے لیے لازم قرار دے دی گئی ہے۔ اسلام تو اصلاحِ احوال کی مسلسل کوشش کو زندگی کا ایک لازمی جزو قرار دیتا ہے۔

اسلام کا مقصدِ اعلیٰ انسانی ترقی ہے۔ اسلام ترقی کے حصول کی راہیں اپنے ایسے اوامر و نواہی سے جو انسان کی معمول کی زندگی کے ہر پہلو' معاشرتی و سیاسی اور اس کے دل و دماغ اور اس کی روح کے ہر جذبہ پر غالب ہیں' واضح اور معین کر دیتا ہے۔ یہ اوامر و نواہی ایک مکمل ضابطۂ معاشرت اور نظام سیاست میں منسلک ہیں۔ اسلام کا نظام ایک عملی نظام ہے۔ اور ایسی حیران کن کامیابی کے ساتھ زیر عمل چلا آ رہا ہے۔ جس نے مورخ کو ورطۂ حیرت میں ڈال رکھا ہے۔

اکثر مصنفین نے اسلام کی فقید المثال کامیابی کو خارجی اثرات یعنی قریبی سلطنتوں کے زوال' بزورِ شمشیر فتوحات اور اس زمانے کی ضعیف الاعتقادی قرار دیا ہے۔ لیکن یہ لوگ اس حقیقت کی کیا وضاحت کریں گے کہ خود مسلمانوں نے جب تک اسلام کے کسی خاص حکم کی اطاعت کی وہ اس کے حلقۂ عمل میں کامیاب ہوئے۔ اور جب انھوں نے اس کے کسی حکم سے روگردانی کی تو اس کے حلقۂ اثر کے مقدر کامیابی سے محروم

ہو گئے۔ ان معترضین کے پاس اس بات کا کیا جواب ہے کہ مسلمان کو جن احکام کا پابند قرار دیا گیا ہے اگر غیر مسلم ان میں سے کسی پر عمل پیرا ہوں تو اس شعبۂ زندگی میں انھیں بھی کامیابی نصیب ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآنی احکامات اور تعلیماتِ نبویؐ تمام بنی نوعِ انسان کے لیے ہیں۔ اسلام قوانینِ فطرت کا ایک مجموعہ ہے ان قوانین کی خلاف ورزی افراد و اقوام کو خسران میں ڈالتی ہے۔ کیونکہ ایسے قوانین انسانی تجربہ سے منکشف نہیں ہو سکتے تھے اور قرطاسِ تاریخ میں کبھی کبھار کوئی صاحبِ فہم و ادراک ہی ان کا سراغ لگا سکتا تھا۔ لہٰذا ان کا انکشاف ایک پیغمبر کی معرفت الہامی صورت میں ہوا تھا۔ ورنہ وہ تو ہمارے طبعی قوانین کی طرح شکوک وشبہات کی گنجائش سے بالاتر قوانینِ فطرت ہیں۔ دوسرے مذاہب ان لوگوں کے لیے جو جسمانی تکالیف' بھوک اور فاقہ کشی کے عذاب سہنے کو اپنی مذہبی تعلیمات کے عین مطابق سمجھتے ہیں' اُخروی کامیابی کا مژدہ سناتے ہیں۔ لیکن اسلام ان تمام لوگوں کو جو بعض قوانین کو اصولِ زندگی بنا کر ان پر عمل پیرا ہوں۔ دُنیا اور آخرت دونوں میں برابر کی کامیابی کی نوید سناتا ہے۔

مسلمان کے نزدیک دُنیا اور آخرت کی تقسیم کوئی معنی نہیں رکھتی۔ کیونکہ ارض وسما کا مالک اللہ تعالیٰ اس دُنیا اور دوسری دُنیا دونوں کا بادشاہ ہے۔ سچے معنوں میں مسلمان بن جانے والے اور اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کا حق اس طرح ادا کرنے والے لوگوں کی عاقبت' جیسے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارشاد ''موتوا قبل ان تموتوا'' (مرنے سے پہلے مر جاؤ) میں کیا تھا' موت کے بعد نہیں اس زندگی میں شروع ہو جاتی ہے۔

اسلام نے اس دُنیا میں جس کامیابی کا وعدہ کیا ہے وہ کسی انسان کی ایسی کامیابی نہیں جس سے دوسروں کی ناکامی اور نامرادی بھی لازم ہو۔ اور نہ ہی اس سے مراد کسی قوم کی ایسی ترقی اور عروج ہے جس کی بنیاد کسی دوسری قوم کے زوال پر کھڑی کی جائے۔ اسلام نوعِ انسانی کے لیے ایک ہمہ گیر کامیابی کا پیغام ہے۔

دُنیا کی ہر مسجد سے پانچ بار روزانہ حَیَّ عَلَی الْفَلَاحِ (بھلائی کی طرف آؤ)

کی صدا بلند ہوتی ہے۔

یہاں فلاح کا مطلب عربی زبان میں بذریعہ کاشت کامیابی حاصل کرنا ہے۔ مسلمانوں میں ایک دوسرا لفظ زکوٰۃ استعمال ہوتا ہے۔ جس کے اصطلاحی معنوں کا علم اس کے لغوی مفہوم کو پوشیدہ کیے ہوئے ہے۔ زکوٰۃ کا مطلب تراش کو بڑھانا اور سیدھا بڑھانا ہے۔ زکوٰۃ کا اصطلاحی مفہوم وہ اسلامی ٹیکس ہے۔ جس کی تلقین قرآن پاک میں عبادت کے ساتھ بار بار آئی ہے۔ زکوٰۃ درحقیقت قوم کی خوش حالی اور نشوونما کی باعث تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ پاک ہے۔ ''امیر لوگوں سے ٹیکس وصول کیا جائے اور اسے غریبوں میں تقسیم کر دیا جائے''۔ جب زکوٰۃ باقاعدگی سے وصول کی جاتی تھی تو مسلمان کی حالت ایسی تسلی بخش تھی کہ زکوٰۃ بانٹنے والوں کو باوجود تلاش بسیار زکوٰۃ لینے والے یعنی نادار لوگ نہیں ملتے تھے اور یہ روپیہ رفاہ عامہ کے کاموں میں استعمال ہو جاتا تھا۔ قرآن پاک میں ارشاد خداوندی ہے:

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا ○ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا (الشمس ۹۱:۹-۱۰)

یقیناً فلاح پا گیا وہ جس نے نفس کا تزکیہ کیا اور نامراد ہوا وہ جس نے اس کو دبا دیا۔

اس کے بعد:

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ○ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى ○ (الاعلیٰ ۸۷:۱۴-۱۵)

فلاح پا گیا وہ جس نے پاکیزگی اختیار کی اور اپنے رب کا نام یاد کیا پھر نماز پڑھی۔

ممکن ہے کہ بعض لوگوں کے دلوں میں یہ خیال پیدا ہو کہ یہ محض اونچے درجے کے اعتقادات ہیں جو زندگی سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ لیکن اسلام عمل ہی کا نام ہے۔ اور تاریخ اسلام میں یہ احکامات ایسے نہیں ہیں جن پر عمل نہ ہوا ہو۔ زکوٰۃ کی صورت میں اسلام نے دُنیا کے سامنے مالی امداد اور خیرات کا ایسا شان دار نظام پیش کیا جس کی بدولت صدیوں تک اسلامی حکومتوں کو اپنے معاشی حالات کی جانب سے اطمینان رہا۔

قرآن حکیم ہمیں بتاتا ہے کہ حقیقی مذہب کسی قیاس یا گمان کا نام نہیں بلکہ عمل کا نام ہے۔

الذین امنوا وعملوا الصلحت

وہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک اعمال کرتے رہے۔

ان الفاظ کی قرآنِ حکیم میں متعدد بار تکرار ہے۔ "وہ لوگ جو ایمان لائے اور بیکار بیٹھے رہے"۔ اسلام کو ایسے لوگوں کی کوئی ضرورت نہیں۔ "جو لوگ ایمان لائے اور گناہوں کے مرتکب ہوتے رہے ان کا وجود ناقابلِ تصور ہے کیونکہ اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی رضا وخوشنودی اور اس کے احکامات کی اطاعت وبجا آوری کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دینا کوشش عمل ہی کا نام ہے۔

اسلام کے زمانۂ عروج میں دینی اور دینوی تعلیمات میں کوئی امتیاز نہ تھا۔ تمام تعلیم کی بنیاد مذہب پر ہی تھی۔ زمانۂ حال کا ایک مغربی مصنف لکھتا ہے۔ "یہ اسلام ہی کا کارنامہ تھا کہ اس نے دوسرے علوم کو بھی وہی مرتبہ عطا کیا جو مساجد میں قرآن' حدیث اور فقہ کی تعلیم کو حاصل تھا"۔ مساجد میں دینی تعلیمات کے ساتھ ساتھ کیمیا' طبیعات' نباتات' فلکیات اور طب کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ مسجد ہی مسلمانوں کے دورِ اوّلین میں ان کی یونیورسٹی تھی اور ہر لحاظ سے اس لقب کی حق دار تھی۔ مسجدوں کی حدود کے اندر علم پر کوئی پابندی نہ تھی۔ مساجد کے دروازے اور مسلمانوں کے دل علم کے حصول واشاعت کے لیے کھلے ہوئے تھے۔

چونکہ دورِ اوّلین کے مسلمانوں نے تمام علوم کی اہمیت وضرورت کو علمی طور پر تسلیم کیا اس لیے اس دور کی اسلامی تصنیفات کا مطالعہ کرنے والے کو آج بھی ان مصنفین کی متانت وسنجیدگی اور ان کی تجر علمیت کا معترف ہونا پڑتا ہے۔

اسلام دین ودُنیا میں کسی امتیاز کا روادار نہیں۔ ایک سچے مذہب کا اثر انسان کے تمام اعمال پر پڑتا ہے۔ قرآنِ پاک نے نیکی اور بدی کی حدیں مقرر کر دی ہیں۔ انسانی ترقی کے لیے نیکی فائدہ مند اور برائی ضرر رساں ہے۔ اسلام کی بنیاد عقل سلیم ہے۔ اسلام میں ایسے شخص کے لیے جو سینٹ آگسٹائن کی طرح یہ کہتا ہو۔ "میں تو اس لیے مانتا

ہوں کہ یہ ویسے ایک ناقابل فہم چیز ہے''۔کوئی گنجائش نہیں۔قرآنِ حکیم صاف اور واضح الفاظ میں اور تکرار کے ساتھ ایسے مذہب کو باطل قرار دیتا ہے جس کی بنا عقلِ سلیم پر نہ ہو۔وہ لوگوں کو بار بار مذہبی معاملات میں غور وفکر کی دعوت دیتا ہے۔

تاریخِ عالم کا تجربہ ایک طرف یہ ثابت کرتا ہے کہ انسانی ترقی کے لیے معقول حد تک آزادیٔ فکر ایک ضروری شے ہے۔دوسری طرف یہ بتاتا ہے کہ جو قومیں اللہ تعالیٰ کی ہستی کا انکار کرتی ہیں۔وہ انتہائی ذلت وخواری سے دوچار ہوتی ہیں۔کیا آزادیٔ فکر اور اللہ تعالیٰ پر پختہ ایمان ایک دوسرے کی ضد ہیں؟

مغربی مفکرین کی ایک جماعت اس خیال کی حامی ہے کہ آزادیٔ فکر اور ایمان باللہ یکجا نہیں ہو سکتے۔اسلام کے زمانۂ عروج میں مسلمانوں نے اللہ تعالیٰ پر ایمان کے ساتھ ہر موضوع اور مضمون پر آزادیٔ فکر کو یکجا کر کے دیکھا دیا۔

اسلام نے کسی بھی چیز کو ایسا تقدس نہیں عطا کیا کہ اس پر کوئی تنقید نہ کی جائے خوارق العادت اور ماورائی فہم صرف ایک ہی ذات ہے۔جس کی وحدانیت ایک مرتبہ تسلیم کر لینے کے بعد اس ذات کے بارے میں بحث وتمحیص کے تمام دروازے بند ہوجاتے ہیں۔یعنی اللہ تعالیٰ...... وہ سب کے لیے ایک ہے۔یکتا و بے ہمتا ہے۔سب کے لیے بڑا مہربان' نہایت رحم کرنے والا ہے۔اسی نے انسان کو عقل کی دولت عطا کی۔ مسلمان مصنفین نے عقل وفکر ہی کو اللہ تعالیٰ کا سب سے بڑا اور بہترین عطیہ قرار دیا ہے۔اور اللہ کی راہ میں یعنی نیکی کے حصول اور بدی سے اجتناب میں اس کی تاکید کی گئی ہے۔اس مقصد کے حصول کے لیے مسلمان کو شریعت کی راہنمائی کا شرف حاصل ہے۔ اسلام میں انسان اور اللہ تعالیٰ کے درمیان کسی واسطے یا وسیلے کی ضرورت نہیں۔

ان اللّٰـه لا یقبض العلم انتزاعا ینتزعه من العباد لکن یقبض العلم بقبض العلماء حتی اذالم یبق عالما اتخذ الناس روسا جهالا فسئلوا فافتوا بغیر علم فضلوا واضلوا

اللہ تعالیٰ علم کو مکمل طور پر چھین کر ختم نہیں کر دیتا اس طرح کہ وہ اس کو اپنے

بندوں سے چھین لے۔ بلکہ وہ علما کو اٹھا کر علم کو بھی اٹھا لیتا ہے۔ یہاں تک جب کوئی عالم باقی نہیں رہتا تو لوگ جاہلوں کو اپنا مذہبی راہنما بنا لیتے ہیں۔ ان سے فتویٰ پوچھا جاتا ہے تو وہ بغیر پوچھے فتویٰ دے دیتے ہیں۔ اس طرح وہ خود بھی گمراہ ہوتے ہیں اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں۔

ان الملائکه لتضح اجنتها یطالب العلم

بے شک فرشتے طالبان علم پر اپنے پر پھیلاتے ہیں۔

هَلْ يَسْتَوِى الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لاَ يَعْلَمُوْنَ (الزمر ۳۹:۹)

کیا وہ لوگ جو علم رکھتے ہیں اور وہ لوگ جو علم نہیں رکھتے برابر ہو سکتے ہیں؟

فضل العالم على الدابد کفضلی علی اونا کم

عالم کو عابد پر اتنی ہی فضیلت حاصل ہے جتنی کہ مجھے تمھارے ادنیٰ ترین فرد پر۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ ایک شخص نمازیں پڑھے' روزے رکھے' زکوٰۃ دے' فریضۂ حج بجا لائے اور دیگر تمام مذہبی فرائض کی ادائیگی کرے۔ اس کے اجر اس کی فہم و فراست کے تناسب سے ہی ہو گا۔ جو اس نے استعمال کی ہے۔ آپؐ کا یہ بھی ارشاد گرامی ہے کہ ایک عالم بے عمل کی مثال اس گدھے جیسی ہے جس پر کتابیں لدی ہوں (اور وہ انھیں نہ پڑھ سکے' نہ ان پر عمل کر سکے)۔

قرآنِ حکیم اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمان اور جہالت کے اجتماع کا کبھی تصور ہی نہیں فرمایا۔ درحقیقت جہالت اور اسلام اکٹھے نہیں ہو سکتے۔ اسلام کے دورِ اوّلین میں غریب مسلمان کی طرح بے علم مسلمان بھی باوجود تلاشِ بسیار نہ ملتا تھا۔

مذہبِ اسلام کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ اس نے مذہب کو اس کے حقیقی میدان عمل یعنی معمول کی زندگی سے متعارف کرایا۔ قرآن پاک میں جس نورِ الٰہی کی طرف اشارہ ہے وہ ہر اس شخص پر آشکار ہے۔ جو اللہ تعالیٰ کے احکامات کی پیروی کرتا ہے۔ کیونکہ وہی نور ہماری زندگی میں اللہ تعالیٰ کی عظمت و کبریائی پر ایمان کی صورت

میں ہمارا چراغِ راہ ہے۔ مذہب کے پیشِ نظر کسی آئندہ زندگی کا دور افتادہ مقصد نہیں۔ اس کا مقصد تو اس دُنیا میں اور اس وقت بنی نوعِ انسان کی خدمت ہے۔ عرب کے بت پرست کافر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کے پیغام کی صداقت کی دلیل کے طور پر معجزے کے طلب گار تھے۔

وَقَالُوْا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ ۭ لَوْلَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُوْنَ مَعَهٗ نَذِيْرًا ۝ اَوْ يُلْقٰٓى اِلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ تَكُوْنُ لَهٗ جَنَّةٌ يَّاْكُلُ مِنْهَا ۭ وَقَالَ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا ۝ (الفرقان ۲۵: ۷-۸)

اور وہ کہتے ہیں یہ کیسا خدا کا رسولؐ ہے جو کھانا کھاتا اور بازاروں میں پھرتا ہے؟ ڈرانے کے لیے اس کے ساتھ کوئی فرشتہ کیوں نہ بھیجا گیا؟ یا پھر اس پر کسی خزانے کے منہ کیوں نہ کھول دیئے گئے؟ یا پھر اس کو کوئی ایسی جنت کیوں نہ عطا کی گئی جس سے وہ کھا سکے۔ بدقماش لوگ کہتے ہیں تم ایک سحر زدہ آدمی کی اطاعت کر رہے ہو۔

اللہ تعالیٰ نے بدقماش لوگوں کو جن الفاظ میں جواب دیا۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ معجزات ہی پیغمبروں کے سچا اور صادق ہونے کی دلیل نہیں۔ پیغمبروں کا کام تو انسان کی عقل کو سنوارنا اور ان میں ذوق تلاش و جستجو ابھارنا ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّآ اِنَّهُمْ لَيَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَيَمْشُوْنَ فِي الْاَسْوَاقِ ۭ (الفرقان ۲۵: ۲۰)

اور ہم نے تم سے پہلے بھی ایسے پیغمبر بھیجے ہیں جو تمھاری طرح کھاتے پیتے اور بازاروں میں چلتے پھرتے تھے۔

یعنی آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے بھی جو پیغمبر مبعوث ہوئے، جنھیں لوگ مافوق الفطرت ہستیاں سمجھتے تھے، انسان ہی تھے۔ جو لوگوں کو اللہ کے نام پر اللہ کی طرف بلاتے تھے۔ اسلامی تعلیمات کے مطابق معجزات مامور من جانب اللہ ہونے کی دلیل نہیں

اور نہ ہی وہ قوانینِ فطرت کی خلاف ورزی کر سکتے ہیں۔ کیونکہ قوانینِ فطرت خود اللہ تعالیٰ ہی کے وضع کیے ہوئے ہیں۔ اس لیے یہ قوانینِ الٰہی ہیں۔

معجزات تو انسانی ترقی کی منزلِ مقصود کے ایسے مقامات کی نشانیاں ہیں۔ جن پر ایسے قوانین جو عوام کی نظروں سے پوشیدہ ہوتے ہیں منصہ شہود پر آ جاتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی بہت سے معجزات منسوب ہیں۔ لیکن کوئی بھی مسلمان ان معجزات کو آپؐ کے اللہ کا سچا پیغمبر اور رسول ہونے کے ثبوت کے طور پر نہیں پیش کرے گا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام اور اس کی کامیابی یعنی قرآن حکیم، اس کی تبلیغ اور اس تبلیغ و دعوت کے ثمرات آپؐ کی صداقت کے ایسے مکمل اور بین ثبوت ہیں جن کے سامنے معجزات کی کوئی ضرورت نہیں محسوس ہوتی۔

اگرچہ آج جہالت اور توہم پرستی نے مسلمانوں کو بیکار قسم کی روایات اور غلط قسم کے اعتقادات کے گورکھ دھندوں میں الجھا رکھا ہے۔ لیکن جہاں قوم کے مسلمات نے انسانی دماغ کو اونچے درجے پر پہنچا رکھا ہو وہاں اس طرح کے غلط اعتقادات اور مذہبی کج روی کا ترقی پانا ناممکن ہو جاتا ہے۔ اصل میں فرسودہ روایات اور مذہبی کج روی کا غالب حصہ تو گذشتہ سائنس کا سرمایہ ہے۔ اسلام یہ توقع رکھتا ہے کہ زمانۂ ماضی کی اس سائنس کو جدید علوم کی روشنی میں بدل دیا جائے۔ اگرچہ مسلمان ہر معاملے میں آزاد ہے۔ لیکن اپنی دماغی و جسمانی اور روحانی صحت و تحفظ کے لیے اس پر ایک اصول کی پابندی لازم ہے۔ اس پابندی کے اندر رہتے ہوئے مسلمان کا فرض ہے کہ اپنے زمانہ کی سائنس کا باریک بینی سے مطالعہ کرے اور اس میں اسے جو چیز فائدہ مند اور معقول نظر آئے اسے قبول کر لے۔ اور ایسا کرنے میں اسے ان غلط رو روایات اور فرسودہ و گم راہ کن اعتقادات سے پیچھا چھڑا لینے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں ہونی چاہیے۔ سائنس کے حقائق کو تسلیم کر لینے اور لایعنی قیاس آرائیوں اور اعتقادات کو ترک کر دینے سے مسلمان کے ایمان کو کوئی خطرہ لاحق نہیں ہوتا۔

مسلمان کا ایمان ہے ''اشهد ان لا الٰه الا اللّٰه و اشهد ان محمد

الرسول اللّٰہ بقول اس واجب الاحترام بوڑھے کافر کے۔ ''ایک ابدی حقیقت اور ایک لازمی داستان سے عبارت ہے۔ گبن کو بھی بعد از خرابیٔ بسیار اعتراف کرنا پڑا تھا کہ ''اس داستان یا افسانے نے واقعات کی روشنی میں اپنا مکمل جواز پیدا کرلیا''۔

ملّتِ اسلامیہ میں آج فرسودہ روایات اور لایعنی قصے کہانیوں کے دقیانوسی پردے ہٹا کر تعلیماتِ اسلامی کو ان کی اصل و احسن صورتوں میں دیکھنے کی روزافزوں خواہش پیدا ہو رہی ہے۔ لیکن یہ خارجی پردے جو اسلام کے پیکرِ جمیل پر ڈال دیئے گئے ہیں مسیحیت کی طرح اسلام کی حقیقت کو مسخ نہیں کر سکے۔ اسلام کا اندورن یا باطن آج بھی بآسانی واضح اور عیاں ہے۔ قرآنِ پاک میں وظیفۂ قدرت یعنی دن رات کے تغیر' مٹی' ہوا' پانی اور آگ کے خواص اور نمو و انحطاط' زندگی اور موت کے اسرار پر غور وخوض کی تاکید آتی ہے۔ اور یہ اس قانون اور نظام کی شہادتیں ہیں جسے انسان نہ بنا سکتا ہے نہ بدل سکتا ہے۔ اور یہ اس حقیقت کے بین ثبوت ہیں کہ اس دنیا میں انسان کی حکمرانی نہیں ہے۔ اس کی آزادیٔ رائے' سعیٔ جمیل تو ایک شہنشاہیت میں عطا کردہ اختیارات کا درجہ رکھتی ہے۔ یہ شہنشاہیت صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے جو دُنیا کا خالق' پروردگار اور رب العالمین ہے۔ انسان حقیقت میں اپنی فطری حالت اور اسباب ربوبیت کی فراوانی پر' جو ہر حال میں اس کا ساتھ دیتے ہیں' کبھی غور وفکر نہیں کرتا۔ قوتِ تخلیق کے ایک تحیّر کن نمونے میں گھرا ہوا انسان ایک ایسی دُنیا میں بھیجا گیا ہے جہاں اسے ایک ایسے مجموعۂ قانون کے تحت زندگی گزارنی ہوتی ہے جس کی کبھی خلاف ورزی نہیں ہوتی۔ وہ لازماً اس ضابطۂ قوانین کے ماتحت زندگی گزارتا ہے کیونکہ یہ قوانین اس کے بنائے ہوئے ہیں۔ وہ ان قوانین کے خلاف عمل کرتے ہوئے زبان ہلانے' ہاتھ اٹھانے حتیٰ کہ سانس لینے کا اختیار اور قدرت بھی نہیں رکھتا۔ انسان فی الحقیقت کسی حشرے کی طرح اپنی محدود دلچسپیوں کی دُنیا میں ایسا قید ہے کہ ان امور پر غور وفکر کرنے کی اسے فرصت ہی نہیں ملتی۔ انسان اپنے اس محدود دائرے میں رہتے ہوئے "ایک ایسے خدا کا طلبگار ہوتا ہے جو تخلیق کے مقصد اور مخلوق کی ضروریات کو بالائے طاق رکھ کر اس کے مخصوص مقاصد کے

حصول میں اس کا مددگار بن جائے۔ بلاشبہ اگر ہم ایک خالق اور مقصدِ تخلیق تسلیم کر لیں تو ہمیں کسی امتیازی سلوک کی امید نہ رکھی چاہیے۔ بلکہ ہمیں اسی مقصدِ تخلیق اور مشیت الٰہی کی اطاعت ومتابعت ہی میں کامیابی کی امید رکھنی چاہیے۔

كَلَّآ إِنَّ الْإِنسَانَ لَيَطْغَىٰٓ ○ أَن رَّآهُ اسْتَغْنَىٰٓ ○ إِنَّ إِلَىٰ رَبِّكَ الرُّجْعَىٰٓ ○

(العلق۹۶: ۷-۸)

ہرگز نہیں۔ انسان سرکشی کرتا ہے۔ اس بنا پر کہ وہ اپنے آپ کو بے نیاز دیکھتا ہے (حالانکہ) پلٹنا یقیناً تیرے رب ہی کی طرف ہے۔

کچھ برس گزرے ایک سکاٹش پادری کی تحریر کردہ کتاب نے جو ''روحانی دُنیا میں قانونِ فطرت'' کے نام سے طبع ہوئی' انگریزی زبان بولنے والوں کی دُنیا میں ایک ہنگامہ سا برپا کر دیا۔ کتاب تو کچھ ایسی اچھی نہیں تھی۔ لیکن میں نے صرف اس کے عنوان کو دیکھتے ہوئے اس کا حوالہ دیا ہے۔ کیونکہ میرے خیال میں اسلام کو زیادہ بہتر صورت میں ''روحانی' معاشرتی اور سیاسی دُنیا میں قانونِ فطرت'' کے نام سے متعارف کیا جا سکتا ہے۔ اسلام اللہ تعالیٰ کی حقیقی شہنشاہیت کے ثبوت کے طور پر ہماری طبعی زندگی پر اثر انداز قوانینِ قدرت کے مطالعہ کی ترغیب دیتا ہے۔ اور پھر یہ ثابت کرتا ہے کہ بالکلیہ طور پر ایسے ہی قوانین انسان کی روحانی اور اجتماعی زندگی پر حاوی ہیں۔ پیغمبروں کے معجزات اور اولیائے کرام کی کرامات کو اس قدر معمولی قرار دیا گیا ہے کہ ان پر ایمان لانا ضروری نہیں سمجھا گیا۔ مسلمان کے ایمان کی بنیاد اللہ کی عالمگیر شہنشاہت' آنحضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور تمام پیغمبروں کے مامور من جانب اللہ ہونے کا اقرار ہے۔ اسلام کی یہی فطری اور بہترین ومعقول بنیاد تھی کہ جرمنی کے معروف مفکر وشاعر گوئٹے نے قرآنِ پاک کا ترجمہ پڑھ چکنے کے بعد بے ساختہ کہا تھا ''اگر اسلام یہی ہے تو ہم میں سے ہر سوچنے والا شخص مسلمان ہے''۔

آج کل ایک ایسا فرقہ جسے اپنی ڈفلی بجانے اور اپنا راگ الاپنے میں بڑی مہارت اور کمال حاصل ہے۔ اسلامی تہذیب پر صرف اس لیے معترض ہے کہ یہ تہذیب

جمہوری، اشتراکی، امرائی اصولوں یا دورِ حاضر میں تجربہ کیے گئے اور بڑی حد تک ناکام پائے گئے کسی اصول پر مبنی ہونے کی بجائے خالص الٰہیت پر مبنی ہے۔ اسلامی تہذیب کی الٰہیت تو کوئی ایسی شے نہیں جس کی یاد صرف بوقتِ عبادت تازہ کر لی جائے اور جسے عملی دنیا کے ہر کام میں بڑے اطمینان کے ساتھ بھلا دیا جائے یا نظر انداز کر دیا جائے۔ بلکہ اسلامی الٰہیت تو ایک زندہ و جاوداں قانون ہے جس پر ہر زمانے میں عمل ہوا ہے۔ یورپ کے ایک عظیم مدبر کا کہنا ہے۔ ''اللہ تعالیٰ کا سیاسیات سے کوئی واسطہ نہیں۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ ان لوگوں کی نظر میں جو واقعات اور حالات حاضرہ کا عمیق نگاہی سے مطالعہ کرتے ہیں، مغربی سیاسات کی سب سے بڑی خامی یہ وہ تدبیر کی مضبوطی کے غرور میں تقدیر کے کرشمہ اور دستِ غیب کی چال کی انکاری ہو جاتی ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کا نادیدہ ہاتھ مضبوط ترین انسانی تدبیروں کو الٹ کر رکھ دیتا ہے۔ مکافاتِ عمل کا قانونِ الٰہی ہمیشہ جاری رہتا ہے۔ نیکی کا بدلہ نیکی ہے اور بدی کا بدلہ بدی۔ یہ قانون ہمارے آنکھیں بند کر لینے سے تبدیل نہیں ہوا کرتا۔ عہد حاضر میں روسی انقلاب اور یونانیوں کی ترکی کو تباہ کرنے کی کوششوں میں ناکامی اس حقیقت کے ناقابل تردید شواہد ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا نادیدہ ہاتھ کس طرح بڑے بڑے مدبرین کی مضبوط و محکم تدابیر کو، جو انسانی نظر میں ہر طرح سے کامیاب قرار دی جاتی ہیں، آناً فاناً اُلٹ کر رکھ دیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی شہنشاہیت سے متعلق، جس کی اسلام نے تلقین فرمائی ہے اور جس کے قیام میں وہ یک گونہ معاون مددگار ہوا، میں خیال کرتا ہوں کہ موجودہ زمانے کی روش ازمنہ وسطیٰ سے مختلف نہیں ہے۔ معترضین کا استدلال ایک غلط مماثلت پر مبنی ہے۔ الٰہیت کا وہ مقصدِ اعلیٰ جو ازمنہ وسطیٰ میں مغرب میں پایا جاتا تھا، کلیسائی رسومات اور معجزانہ روایات سے منسوب تھا۔ اور اس الٰہیت کو اس بد قماش و بدکار دُنیا سے جائے فرار سمجھا جاتا تھا۔ لٰہذا یہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ تمام الٰہیات ناقابلِ عمل ہیں اور تارک الدُنیا لوگوں کے فلسفوں اور مذہبی جنونیوں کے قیاسات سے زیادہ کوئی حیثیت و حقیقت نہیں رکھتیں۔ آج سائنس نے معجزات کو ماننے سے انکار کر دیا ہے اور انسانوں نے اس دُنیا کی دولت

سے فائدہ اٹھانا اور اسی دُنیا میں اپنی حالت سدھارنا سنوارنا ہی اپنی زندگی کا مقصد بنالیا ہے۔ مگر بہترین انسان تو وہ ہیں جو اپنی ذاتی آسائش سے زیادہ دوسروں کی حالت سدھارنے کی مساعی کریں۔ پس الٰہیت کا ایسا نصب العین جس کی بنا معجزوں پر تھی۔ جو حقیقی انسانی ضروریات سے دُور تھا' وہ نصب العین جو اس دُنیا کو شیطان کی سلطنت سمجھتا تھا اور جو ہر نجات کے خواہاں کو اس سے دُور رہنے کا سبق دیتا تھا درحقیقت حسرت و مایوسی کا ایک پیغام تھا اور اسے واقعی فرسودہ اور حالاتِ حاضرہ میں غیر موزوں اور دقیانوسی سمجھنا چاہیے۔ لیکن الٰہیت کا وہ مقصدِ اعلیٰ جس کی بنیاد حق و راستی پر ہو' ایسے سلوک کا مستحق نہیں۔ حق یہ ہے کہ موجودہ زمانہ اپنی تباہ کن خودغرضیوں کی وجہ سے ایک ایسے نصب العین کا متلاشی ہے اور یہ وہ نصب العین ہے جس کی بنیادیں فطرتِ انسانی پر قائم ہونے کی وجہ سے افکارِ انسانی کی ترقی اور سائنس کے اکتشافات سے کمزور نہیں ہوسکتیں۔ سائنس کی ترقی عجائباتِ فطرت کو جتنا بے نقاب کرتی ہے اتنی ہی شدت کے ساتھ ایک سچے مسلمان پر اللہ کی عظمت' شان و شوکت اور حاکمیت عیاں ہوتی چلی جاتی ہے۔ جب تک قوانینِ قدرت قائم ہیں اور افراد و قوم کے اعمال کے اچھے اور برے نتائج سامنے آتے رہتے ہیں۔ تب تک انسان کو انسانی زندگی میں اپنی رائے اور مقصد سے ایک بلند تر رائے اور بلند تر مقصد اور بلند تر فیصلے کی اہمیت تسلیم کرنے کی ضرورت لاحق ہوتی ہے اور تب تک انسان کو اسی رضا اور مقصدِ اعلیٰ پر سپردگی کر دینے کی ضرورت رہتی ہے۔ اور قرآنی تعلیمات کے مطابق اسی رضا و تسلیم اور مقصدِ اعلیٰ کا نام اسلام ہے۔

موجود معاشرتی نظام کی بنیادیں کمزور پڑ چکی ہیں۔ اور عہدِ حاضر نے اشتراکیت' فاشزم' بالشیوازم' لادینیت اور جتنے دوسرے نظام متبادل کے طور پر پیش کیے ہیں اسلام ان کے مقابلے میں ایک مکمل نظام حیات پیش کرتا ہے۔ اسلامی نظام کو دوسرے نظاموں کے مقابلے میں یہ فوقیت حاصل ہے کہ یہ تاریخ عالم میں انتہائی کامیابی کے ساتھ اور نمایاں طور پر زیرِ عمل رہ چکا ہے۔ اور اس پر جتنی شدومد سے عمل ہوا ہے اتنی ہی زیادہ کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ ہر مسلمان اس پر یقین کامل رکھتا ہے کہ ہر قوم مآل کار اسلام

کے بنیادی اصول ضرور قبول و اختیار کر لے گی چاہے وہ اپنے قبولِ اسلام کا اعلان نہ کرے۔ کیونکہ اسلامی قوانین فطری یا الہامی قوانین ہیں جن پر انسانی ترقی کا انحصار ہے۔ انسان اس الہام کے بغیر ایک عرصہ گزرنے اور تلخ تجربات کا مزہ چکھنے اور دیگر طرائق کو اختیار کرنے اور ان کی ناکامی سے آشنا ہونے کے بعد ان قوانین کا ضرور پتہ لگائے گا۔ اسلام اقوام اور گروہوں کے موجودہ تصادم اور انحطاط کی بجائے امن وسکون اور استقامت و استقلال کی نوید سناتا ہے۔ اس نظام کے حسن و قبح کے پرکھنے سے کسی شخص کا صرف اس وجہ سے انکار کر دینا کہ اس نظام کی بنیاد توحیدِ الٰہی پر ہے اور یہ کہ یہ نظام ایک پیغمبر کے ذریعے دُنیا میں متعارف ہوا حماقت اور ملحدانہ تعصب کی انتہا ہے۔

لیکن ملحوظ رکھیے کہ اسلامی نظام سے دُنیا صرف اس لیے بیزار نہیں کہ اس تہذیب کی بنیاد توحید الٰہی پر ایمان ہے۔ اس کی وجہ مسلمانوں کی وہ حیثیت اور حالت ہے جو کئی زمانوں پر محیط چلی آ رہی ہے۔ ازمنۂ وسطیٰ کے مسیحی تو اس تہذیب کو جاننے سمجھنے سے محروم تھے کیونکہ ان پر ان کے مذہبی زعما بری طرح مسلّط تھے۔ وہ پادری اور بطارکہ بھی آج کے پادریوں اور بطارکہ کی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کٹر دشمن اور انھیں کاذب نبی کہا کرتے تھے۔ (العیاذ باللہ) اور کسی مسیحی کو یہ سوچنے سمجھنے نہ دیتے تھے کہ اس نبیؐ کا مذہب دُنیا کے لیے کسی فائدے یا بہتری کی چیز ثابت ہو سکتا ہے۔ مسیحیوں اور مسلمانوں کے درمیان آج سے عرصہ قبل لڑی جانے والی جنگوں نے ایک حد قائم کر دی تھی۔ جس کی وجہ سے ان کے مابین نفرت وتعصب کی دیواریں بلند ہوتی رہیں۔

آج جبکہ یہ رکاوٹ درمیان سے ہٹ گئی ہے تو بدقسمتی سے مسلمانوں کی حالت ایسی نہیں رہی جو دوسروں کے دلوں میں یہ خیال پیدا کر سکے کہ کسی زمانے میں مسلمان بھی انسانی ترقی کے راز سے آشنا رہے تھے۔

آج مسلمان کی حیثیت اور اس کا تعلیماتِ اسلامی پر عمل پیرا ہونا ایک افسوس ناک بات بن چکی ہے۔ ان حالات میں اگر دُنیا مسلمانوں کی اس ذلت و خواری کو اسلام سے تعلق پر محمول کرے تو اس پر کوئی تعجب نہیں ہونا چاہیے۔ لیکن درحقیقت

مسلمانوں کی پستی و ذلت کے لیے اسلام کو موردِ الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا بلکہ اس طرح جیسے کہ پادریوں کی عیسائیت کو مغرب کی موجودہ مادی ترقی کا ذمہ دار نہیں قرار دیا جا سکتا۔ مسیحیت میں آزادیٔ فکر کا قطعاً کوئی تصور موجود نہ تھا۔ عیسائی لوگ پادریوں کے پنجہ استبداد میں گرفتار تھے۔ وہ وقت جب مسیحی کلیسا کی فرمانروائی اپنے شباب پر تھی' آج دورِ سیاہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اسلام نے انسانوں کو آزادیٔ فکر کی نعمت سے روشناس کیا۔ اسلام میں مذہبی پیشوایان کی کوئی جماعت نہیں تھی اور وہ زمانہ جب اسلام اپنی پوری شان وشوکت کے ساتھ جلوہ فرما تھا ایک زرین عہد شمار ہوتا ہے۔

پھر جب مسلمانوں نے خاص اسلامی تعلیمات سے صرفِ نظر کرتے ہوئے ملاؤں کی پیروی اختیار کرنی شروع کردی یا قرآن پاک کے الفاظ میں اربابا من دون اللّٰہ کو اپنا مقتدرِ اعلیٰ بنالیا' جب وہ لغت کے گورکھ دھندوں میں پھنسے' جب انھوں نے تلاش علم کے حکم سے منہ موڑلیا' جب انھوں نے آزادیٔ فکر سے کنارہ کیا اور جب انھوں نے احسنت کو خیرباد کہہ دیا تو نتیجہ سوائے ذلت وخواری' پستی و زوال کے اور کیا نکل سکتا تھا؟ اپنی تاریخ کے ایک دور میں مسلمانوں نے شریعتِ اسلامیہ کے اس حصے سے جس میں انھیں تلاش علم اور مطالعۂ کائنات کی ہدایت کی گئی تھی' انحراف کیا۔ مگر اس زمانے میں مغرب کے مسیحیوں نے باوجود پادریوں کی مخالفت کے شریعت اسلامیہ کے اس حصہ پر عمل درآمد کرنا شروع کیا اور ترقی کی منازل چڑھتے گئے۔

اسلام نے ایسے مذہبی گروہوں کی سخت مخالفت کی ہے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے بندوں کے مابین وسیلہ بن کر ان کی روحوں پر قابض ہو جائیں۔ کیونکہ اس طرح کی مذہبیت انسانی ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہے۔ ایسی ملائیت جیسی کہ عیسائیوں میں موجود تھی ایک برحق دین سے مطابقت نہیں رکھ سکتی۔ جس کا مقصد بزبان قرآن پاک غلامی اور ہلاکت نہیں' آزادی اور ترقی ہے۔ اس وسیع دُنیا کے ہر مسلمان پر یہ حقیقت آشکارا ہوچکی ہے کہ اپنی ذلت و پستی کا ذمہ دار وہ خود ہے۔ اور دُنیا میں اسے دوبارہ عزت و وقار' عظمت وسربلندی دوبارہ اسلام کی متابعت ہی سے حاصل ہوسکتی ہے۔

آپ حضرات یہ سوچتے ہوں گے کہ میں اپنے اصل موضوع تہذیب کو چھوڑ کر مذہب کے موضوع کو لے بیٹھا ہوں۔ لیکن سچ بات یہ ہے کہ اسلامی تہذیب مذہب سے گہری وابستگی رکھتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی بے مثال ربوبیت کا اعتراف اسلامی تہذیب کی اساس ہے۔ اس لیے میں اپنی تقریر کے موضوع کو ان اشارات کے بغیر جو میں نے اس وقت کیے ہیں مکمل نہیں کر سکتا تھا۔ اسلامی تہذیب کے زمانۂ عروج یا دورِ انحطاط میں آپ جب کسی سائنس، فنون، ادب، معاشرت یا کسی دوسرے شعبہ میں اس کے کارہائے نمایاں کا مظاہرہ کریں، اللہ تعالیٰ کی عالمگیر اور کلی شہنشاہت کے مذہبی اعتراف سے آپ اسے کبھی خالی نہ پائیں گے۔ اسلامی تہذیب کا یہی ایک امتیازی نشان ہے۔ اور یہ چیز اسلامی قومیت کو عالمگیر بھائی چارے کا ہم معنی بنا دیتی ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی عالمگیر شہنشاہت کو تسلیم کر لینے کا لازمی نتیجہ دُنیا بھر کے انسانوں کی عالمگیر اخوت کا اعتراف و تکریم ہے۔

ooo

خطبۂ دوم

اسباب عروج و زوال

آج اسلام کے جس تہذیبی پہلو پر میں روشنی ڈالنا چاہتا ہوں وہ اس کی ''انسانیت'' ہے۔ جس سے مراد بنی نوعِ انسان کے لیے اسلام کی خیرخواہی اور منفعت رسانی ہی نہیں بلکہ اس کے نکتۂ ہائے نظر کی عالمگیریت بھی ہے۔

اسلام میں مسلم اور غیرمسلم کے لیے الگ الگ قوانین و معیارات نہیں۔ اللہ کی شہنشاہیت کسی امتیازی سلوک کی حامی نہیں۔ اللہ کا قانون سب کے لیے ایک سا ہے۔ ایسے مسلمانوں سے جن کی زبانیں تو قانون الٰہی سے زبانی قرار سے نہ تھکتی ہوں لیکن جو بے عمل ہوں، وہ غیرمسلم زیادہ خوش قسمت ہیں جو قانونِ اسلامی کی عملی متابعت کی سعادت سے خوب بہرہ ور ہیں۔

إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا مَا بِأَنفُسِهِمْ ؕ (الرعد۔ ۱۳:۱۱)

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی۔ جس کو اپنی حالت بدلنے کا
خیال نہ ہو۔

جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ اعتقادات کا محض زبانی اقرار ہی معیار نہیں بلکہ ان پر عمل ہے۔ اس دُنیا اور آخرت میں انسان اپنے عمل سے ہی جانچا جاتا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ آپ لوگوں کے ذہن میں تاریخِ اسلام کا ایک نمونہ ضرور موجود ہے۔ تاریخ اسلام دُنیائے اسلام کی تین مشہور اقوام اور زبانوں کے نام اور مناسبت سے تین بڑے ادوار یعنی عربی، فارسی اور ترکی میں تقسیم کی جا سکتی ہے۔ میں یہ بھی فرض کیے

لیتا ہوں کہ آپ میں سے ہر کسی نے یہ ضرور سن رکھا ہو گا کہ اسلام اپنے دورِ اولین میں بزورِ شمشیر پھیلا۔ قرآن پاک میں ارشاد خدوندی ہے۔

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۙ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ۚ لَا انْفِصَامَ لَهَا ۗ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝ (سورۃ البقرہ ۲:۲۵۶)

دین کے معاملے میں کوئی زور زبردستی نہیں۔ صحیح بات غلط خیالات سے چھانٹ کر رکھ دی گئی ہے اب جو کوئی طاقت کا انکار کر کے اللہ پر ایمان لے آیا۔ اس نے ایک ایسا مضبوط سہارا تھام لیا جو کبھی ٹوٹنے والا نہیں۔ اور اللہ (جس کا اس نے سہارا لیا ہے) سب کچھ سننے والا ہے۔

دوسرا ارشاد ہے:

وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ۗ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ۝ (البقرہ ۲:۱۹۰)

اور لڑو اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے جو لڑتے ہیں تو سے اور کسی پر زیادتی نہ کرو۔ بے شک اللہ تعالیٰ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

بے شمار قرآنی آیات اس امر کی تائید میں پیش کی جا سکتی ہیں کہ مسلمانوں کو اس کی بھی ممانعت ہے کہ وہ محض اختلاف رائے کی وجہ سے کسی سے سختی سے پیش آئیں۔ مجھے تو اس تعلیم کے خلاف قرآن ہونے کی کوئی وجہ ہی نہیں نظر آتی۔ بعد میں جو کچھ بھی رونما ہوا ہو اسے تھوڑی دیر کے لیے بھلا دیجیے۔ یہ واقعی ہے کہ اسلام کے دورِ اول میں جب قرآنِ حکیم ہی کا قانون نافذ تھا اور جب سب چھوٹے بڑے اسے کلام الٰہی سمجھتے ہوئے بڑے اخلاص اور دل کی انتہائی گہرائیوں کے ساتھ اس کی تابع فرمانی کو باعث سعادت اور ذریعۂ نجات سمجھتے تھے' قرآنی احکامات کی خلاف ورزی کا تصور بھی محال تھا۔

اسلام کی تمام جنگیں و غزوات جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے عہد میں پیش آئے سراسر مدافعانہ تھے۔ ان محاربات میں مسلمانوں نے

اپنے دشمنوں کے ساتھ جس رحمدلی اور رواداری کے سلوک کیا اس کی نظیر اقوامِ عالم کی تاریخ پیش کرنے سے قاصر ہے۔قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں نے اس وقت آدھی دُنیا فتح کرلی اور اسے ایسا حلقۂ بگوش اسلام بنا دیا کہ آج تک کوئی بڑی سے بڑی طاقت بھی اس کے ایمان میں رخنہ نہ پیدا کرسکی۔مسلمانوں کا یہ محیر العقول کارنامہ ان کی تلوار کی بدولت نہ تھا۔ بلکہ ان کے حسن سلوک اور تقویٰ کا نتیجہ تھا۔کیونکہ اس دور میں مسلمان سب لوگوں سے بڑھ کر بہترین و اعلیٰ ترین کردار و اخلاق کے حامل تھے۔

مسلمانوں کی ہمسایہ اقوام

آیئے اب ذرا اس زمانے کی مسلمانوں کی ہمسایہ اقوام پر نگاہ ڈالیں۔مصریوں' شامیوں' ایرانیوں اور میسوپوٹیما کے باشندوں کو دیکھئے۔ان میں ۹۰ فی صد لوگ غلامانہ زندگیاں گزرا رہے تھے اور صدیوں سے اس حالت میں چلے آ رہے تھے۔بعض ملکوں میں عیسائیت کی آمد بھی ان لوگوں کی حالت میں کوئی خاطر خواہ تبدیلی نہ پیدا کرسکی۔ مسیحیت حکمرانوں کا مذہب تھا جسے انھوں نے ہر خاص و عام پر ٹھونس دیا تھا۔عوام کے اجسام امراء کی غلامی کے لیے وقف تھے اور ان کی روحیں پادریوں کے پنجۂ استبداد میں جکڑی ہوئی تھیں۔عیسائیت کے مقصد اعلیٰ کی ذرا سی جھلک نے صرف اخروی نجات کی امید بندھا رکھی تھی۔ امراء لہو ولعب میں غرق اور اس تہذیب کے علمبردار تھے جسے ترقی نہیں بلکہ بدکرداری اور اخلاقی زوال کہا جا سکتا ہے۔عوام کی حالت قابلِ رحم تھی۔ جزیرہ نما عرب کے آس پاس کے ان ممالک میں جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بادشاہوں کے پاس اپنے سفراء بھیج کر انھیں اوہام پرستی اور بدعقیدگی ترک کر کے دعوتِ توحید دی' آپؐ کے سفراء کے ساتھ جو بدسلوکی کی گئی ۔اور نئے مذہب (اسلام) کی بیخ کنی کرنے کے لیے جو جنگی تیاریاں شروع ہوئیں ان سے ان ممالک میں ایک تہلکہ ضرور مچ گیا۔عوام کو یہ کہہ کر خوف زدہ کیا گیا کہ اسلام (العیاذ باللہ) ایک شیطانی مذہب ہے اور مسلمان ان کے لیے موت و ہلاکت کے پیامبر۔لیکن دُنیا نے جلد ہی دیکھ لیا کہ مسلمان ان ممالک میں فاتحانہ داخل ہوئے اور ان کے حسنِ سلوک نے ان تمام

اقوام کو حلقہ بگوش اسلام کر دیا۔

اسلام یا تلوار

اس زمانے سے پہلے کی انسانی تاریخ میں مفتوح کی زندگی ہمیشہ فاتح کے رحم و کرم پر ہوتی تھی۔ خواہ وہ فاتح کا ہم کیش ہی کیوں نہ ہو اور خواہ اپنی اطاعت میں کتنا ہی عاجز و کامل کیوں نہ ہو۔ غیر مسلموں کا نظریۂ جنگ آج تک یہی چلا آ رہا ہے۔ اسلامی قانون کے مطابق وہ تمام مفتوحین جو دائرہ اسلام میں داخل ہو جاتے تھے' ہر لحاظ سے مسلم فاتحین کے ہم پلہ ہو جاتے تھے۔ لیکن جو مفتوحین اپنے پرانے مذاہب پر قائم رہتے تھے انھیں اپنی حفاظت کے لیے مسلم فاتحین کو ایک ٹیکس (جزیہ) ادا کرنا ہوتا تھا۔ جس کے بعد انھیں ہر طرح کی مذہبی و معاشرتی آزادی حاصل ہو جاتی تھی اور مسلمانوں پر ان کی جان و مال کی حفاظت فرض ہو جاتی تھی۔۔

دُنیا نے ''تلوار اور اسلام'' کی نہایت ہی غلط وضاحت پیش کی ہے۔ تلوار سے مراد جنگ و جدل' قتل و غارت' تباہی و بربادی ہرگز نہیں تھی صرف جنگ تھی۔ مسلمانوں کے مقابلے میں آنے والوں کے سامنے صرف دو ہی راستے کھلے تھے۔ جنگ یا اسلام ...... یعنی قبولِ اسلام یا اسلام کے سامنے سرنگوں ہو جانا۔ جب تک ان میں سے ایک صورت پیدا نہ ہو جائے' حریف مفتوح شمار نہیں ہو سکتا تھا اور اس کے خلاف جنگ جاری رہتی تھی یعنی تلوار بے نیام رہتی تھی۔

مسلمانوں نے مصر شام میسوپوٹمیا' ایران اور شمالی افریقہ کے مفتوحین میں باہمی شادیاں کیں اور یہ ایک ایسا اعزاز و افتخار تھا جو ان ممالک کے باشندوں کو اپنے پہلے فاتحین کے ہاتھوں کبھی نصیب نہ ہوا تھا۔ نہ ہی وہ اس کا کوئی خیال یا گمان کر سکتے تھے۔ اسلام نے نہ صرف ان لوگوں کو سیاسی آزادی کی دولت عطا کی بلکہ انھیں ذہنی آزادی جیسی نعمت سے بھی بہرہ ور کیا۔ اسلام کی بدولت انسانی سوچ و فکر پر پادریوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ ان تمام مفتوحہ علاقوں کے باشندے سوائے ایرانیوں کے عربی کو اپنی قومی زبان مانتے' اپنے آپ کو عربوں کی اولاد کہتے اور آج تک اسلامی سلطنت کو روئے

زمین پر اللہ تعالیٰ کی شہنشاہت کا قیام سمجھتے ہیں۔

مسلمانوں کی رواداری

ان مفتوحہ علاقوں کے باشندوں پر جنھیں باعزت طور پر زندگی بسر کرنے کا کوئی موقع نہ نصیب ہوا تھا' اسلام کی عطا کردہ آزادی نے وہی اثر کیا جو کرنا چاہیے تھا۔ ان ممالک نے مسلمانوں سے میل جول کے بعد محیر العقول ترقی کی۔ سائنس فنون اور ادب میں اُن ممالک کے کارہائے نمایاں آج تک تاریخ کے صفحات کی رونق ہیں۔ تاریخ کا یہ دور جنگوں کے تسلسل کے باوجود بے حد خوشگوار ہے۔ اس دور کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنے سے قبل یہ ضروری ہے کہ مغربی مورخین کی ہر سطر وحی یا الہام نہ سمجھی جائے۔ یا بالفاظ دیگر اس زمانے کے مخالفینِ اسلام کے زہریلے پروپیگنڈے سے خبردار رہنے کی بے حد ضرورت ہے۔

مجھے زمانۂ شباب میں شام کے ان عیسائیوں سے ملنے کے کافی مواقع میسر آئے ہیں جن کے آباء واجداد نے اسلامی فتوحات کے زمانے میں اپنا آبائی مذہب ترک نہ کیا۔ یہ لوگ اسلام کے دورِ اول کو بہترین عہد اور حضرت عمرؓ بن الخطاب خلیفۂ ثانی کو اپنے مذہب کا جلیل القدر محسن مانتے ہیں۔

مشہور قومی قصے اور کہانیاں بعض اوقات ماضی کے حالات اور واقعات کا علم دلانے میں تحریر شدہ تاریخ سے زیادہ مستند اور فائدہ مند ثابت ہوتے ہیں۔ لیکن اگر لکھے ہوئے تحریری حالات و واقعات کے مطالعہ ہی سے باریک بینی اور محنت سے حقائق کی جستجو کی جائے تو ثابت ہوگا کہ ہر چند کہ مسیحیوں کے ساتھ مسلمانوں کا رواداری سے پیش آنا بے حد مشکل بنا دیا گیا تھا۔ پھر بھی دورِ اول کے مسلمانوں میں عیسائیوں کے خلاف مذہبی جنونیت اور تعصب و مخالفت کے جذبات نہیں پائے جاتے تھے۔ بلکہ ایسے جذبات صلیبی محاربات کے بعد پیدا ہوئے۔ بہت سے عیسائی اسلام کی اعلانیہ تضحیک و توہین کے ارتکاب کو ایک مذہبی خدمت اور اس کے نتیجہ کے طور پر قدرتی جذبۂ نفرت کے تحت حکمرانوں کے ہاتھوں قتل ہونے کو شہادت و سرخروئی سمجھتے تھے۔ مختلف ممالک میں بعض

اوقات عیسائیوں کی یہ مذہبی دیوانگی ایک متعدی مرض کی صورت اختیار کر لیتی تھی۔ مسلمان حکمرانوں نے اس دیوانگی کا جس پر سکون اور معقول طریقے سے علاج کیا وہ تاریخ اسلام کا ایک زریں کارنامہ ہے۔ مجھے چونکہ کسی آیندہ خطبے میں مسلمانوں کی رواداری پر تفصیلاً روشنی ڈالنی ہے اس لیے میں فی الحال واہاشا کی کتاب ''عرب ہسپانیہ'' سے ایک اقتباس پیش کرنا کافی سمجھتا ہوں۔

''مسلمانوں کے کسی دوسرے دور کے مقابلے میں نویں صدی کے وسط میں کلیسا سے متعلق ہماری معلومات کا دائرہ زیادہ وسیع ہونے کا سبب مذہبی انتہا پسندی یا جنون کی وہ وبا ہے جو قرطبہ میں اس زمانے میں نمودار ہوئی۔ عیسائیوں کو مساجد میں داخل ہونے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین کی ممانعت تھی اور اس جرم کی سزا موت یا قبول اسلام تھی۔ فلاؤز نامی ایک ہسپانوی مصنف رقم طراز ہے: یہ شہیدوں کا ایک بھیانک جرم تھا وہ اگرچہ اپنے خیال میں اس طرح اپنے مذہب کا درجہ بلند کر دیتے تھے لیکن مسلمان قاضی پورے تحمل اور رواداری سے کام لیتے تھے اور ان مذہبی جنونیوں کی زبان سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے پیروکاروں کی توہین اپنے کانوں سے سن لینے کے بعد ہی فیصلہ صادر کرتے تھے۔ ایک اور تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں وہ عیسائی ''شہدا'' قرطبہ کی جامع مسجد میں داخل ہوئے اور اپنے مذہب کی تعریف کرنی شروع کر دی۔ انھوں نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے کاذب ہونے اور ان پر ایمان لانے والوں کو جہنم میں جانے پر تقریر بھی شروع کر دی۔ ایسے جرم کا ارتکاب کے بعد اگر یہ معلوم ہو کہ یہ عیسائی مذہبی جنونی اپنی جانیں گنوا بیٹھے تو ہمارے لیے اس میں حیرت کی بات نہیں ہوسکتی۔ مسلمان حکمرانوں اور باشعور عیسائیوں نے بھی ان مذہبی انتہا پسندوں کو اس طرح کی ہلاکت سے روکنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ اس معاملے میں بشپ رکفورڈ کی کوشش قابلِ تعریف ہے۔ اس نے عیسائیوں کو اس طریقے سے شہادت کا درجہ حاصل کرنے سے منع کیا۔ کیونکہ مسلمانوں کی طرف سے ان پر تبدیلیٔ مذہب کے لیے کوئی جبر نہ تھا۔ اس بشپ نے اپنے اس حکم کی خلاف ورزی کرنے والے عیسائیوں کو سزائیں بھی

دیں۔ عبدالرحمٰن دوم نے اسے اندلس کا اسقفِ اعظم مقرر کیا تا کہ وہ قرطبہ میں بھی عیسائیوں پر شائستہ انداز میں اثر انداز ہو۔ وہاں بھی رکفورڈ نے بہت سے عیسائیوں کو یہاں تک کہ قرطبہ کے بشپ کو بھی حوالۂ زنداں کر دیا تا کہ اس فتنہ آرائی اور شرانگیزی کا سدِ باب ہو سکے۔

اس طرح کی مذہبی انتہا پسندی کی مثالیں ایشیائی ممالک کی تاریخ میں اور بھی ملتی ہیں جہاں مسلمانوں نے اس طرح کی شرانگیزیوں کو اور بھی زیادہ تحمل اور رواداری سے برداشت کیا۔ مسلمانوں نے مشرق و مغرب دونوں حصوں میں عیسائیوں کے ساتھ زیادہ سے زیادہ رواداری برتی ہے۔ مشہور پارسی مستشرق جی۔ کے۔ نریمان نے اپنے علمی و تحقیقی انکشافات سے ثابت کیا ہے کہ عربوں کے ہاتھوں زرتشتیوں کے قتل اور وہاں سے ان کے دوسرے ملکوں کو فرار کی کہانی کی کوئی مستند حیثیت نہیں۔ زرتشتی آج بھی ایران میں آباد ہیں۔ شام میں مسیحی خلافت راشدہ اور بنی امیّہ کے دور حکومت کو اسلامی فراخ دلی اور رواداری کا سنہرا زمانہ کہہ کر یاد کرتے ہیں تو مجھے اس پر حیرت ہوا کرتی ہے۔ کیونکہ بنی امیہ کے چند خلفاء کا دامن ان ہولناک ستم رانیوں سے داغ دار ہے جن پر ان کی خلافت کے ستون کھڑے کیے گئے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ بنی امیہ نے اسلام کی قابلِ قدر خدمات انجام دیں۔ انھوں نے اسلام کی سادہ، دل پذیر اور پسندیدہ عربی صفت کو قائم رکھا۔ انھوں نے اپنے پایۂ تخت دمشق میں اپنے اور رعایا کے درمیان محبت و اخوت کے وہی تعلقات قائم رکھے جو خلافتِ مدینہ کا طرۂ امتیاز تھے۔ ان کے عہدِ حکومت میں بھی خلیفہ منبر پر کھڑے ہو کر خطبہ دیا کرتا تھا۔ (خطبۂ جمعہ) کتاب 'الفخری' میں اس خاندان کے ایک نہایت روشن خیال اور ژرف نگاہ خلیفہ عبدالملک بن مروان کی پریشانیوں اور تفکرات کی ایک مختصر سی کہانی اس طرح بیان کی گئی ہے کہ: ''کسی نے خلیفہ سے دریافت کیا آپ کے بال قبل از وقت کیوں سفید ہو گئے ہیں'' تو خلیفہ نے جواب دیا ''مجھے منبر پر کھڑے ہو کر عربی میں غلطی کر جانے کے خوف نے بوڑھا کر دیا ہے''۔ کیونکہ خلیفہ کے نزدیک عربی میں غلطی کر

جانا ایک نہایت بھیانک بات تھی۔ خلفائے راشدین کے بعد دوسرا درجہ امیر عبدالرحمٰن کو حاصل ہے۔ وہ بھی خاندان بنی امیہ ہی کے فرد تھے۔ اس خاندان کی ہلاکت اور تباہی کے بعد وہ مغرب کی طرف فرار ہو گئے۔ انھوں نے ہسپانیہ (اندلس) پہنچ کر ایک ایسے خاندان کی بنیاد ڈالی جس نے صدیوں تک اندلس کو مغرب کے لیے علم و ترقی کا گہوارہ بنائے رکھا۔

تاریخ کے طالب علم کو یہ بات ہمیشہ یاد رکھنی چاہیے کہ بنو عباس کی خلافت بنوامیہ کی سنّیت اور فاطمیوں کی تشیعیت کے درمیان ایک مفاہمت کی صورت تھی۔ بنی امیہ کے نزدیک تو بنی عباس بھی شیعہ ہی تھے۔ جب آپ لوگ ہسپانیہ کی تاریخ میں شیعوں کا تذکرہ دیکھیں تو یاد رکھیں کہ وہ ہرگز ایسے نہیں تھے جنھیں ہم شیعہ کہتے ہیں۔ بلکہ وہ ایسے لوگ تھے جنھیں ہم سُنّی کہتے ہیں۔ وہ بنی عباس کے مقلد اور بنی امیہ کے مخالف تھے۔ یہ حقیقت بھی فراموش نہ کرنا چاہیے کہ بنی عباس کی خلافت ایک نہیں بلکہ دو فریب کاریوں پر قائم ہوئی۔ ایک طرف تو انھوں نے اہل بیت کو یقین دلایا کہ وہ تختِ خلافت انھیں ہی پیش کریں گے۔ دوسری طرف انھوں نے ایسے پر جوش و سرگرم عمل سنّیوں کو' جو بنی امیہ کے حامی لیکن ان کی موروثی حکمرانی کے خلاف تھے' یقین دلایا کہ وہ ایسے مسلمانوں میں سے جو اپنی قومی خدمات کے سلسلے میں نمایاں حیثیت اور مرتبے کے حامل رہے ہوں خلیفہ کے انتخاب کے اصول کا احیا کریں گے۔ انھوں نے ان دونوں وعدوں میں سے کوئی وعدہ نہ نبھایا۔ بلکہ خود ہی تختِ خلافت پر براجمان ہو گئے اور ایک نئے خاندانِ خلفاء کے بانی بن گئے۔ انھوں نے بنی امیہ کے افراد کو موت کے گھاٹ اتارنا شروع کر دیا۔ ان مقتولین میں صرف ایک فرد جو ہسپانیہ بھاگ گیا' زندہ بچ سکا۔ کیونکہ اس خاندان کو شام' مصر' نجد' شمالی افریقہ میں زبردست عوامی تائید حاصل تھی اور اس خاندان کا ہر فرد ان (عباسیوں) کا زبردست حریف بن سکتا تھا۔ اور اہلِ بیت کو تو انھوں نے ان کے جائز حق خلافت کی بدولت ستانا اور اذیتیں دینا شروع کر دیا۔ ان دو فریقین کی آپس کی لڑائی کو مذہبی اختلافات پر مبنی قرار دینا درست نہیں۔ وہ تو

شمالی اور جنوبی عرب کے قبائل کا ایک پرانا جھگڑا تھا' جو زمانہ جاہلیت سے چلا آ رہا تھا۔

اسلامی حکومت کی سادگی اور وضعداری بنی امیہّ کے اس آخری فرد (عبدالرحمٰن الداخل) کے ساتھ ہسپانیہ منتقل ہو گئی۔ مشرق کی خلافت بنی عباس کے حصہ میں آئی جس پر پہلے سے ہی ایرانی رنگ چڑھا ہوا تھا۔ ان کے زمانے میں پایۂ تخت دمشق سے بغداد (عراق) منتقل ہو گیا۔ اس طرح وہ بغداد معرضِ وجود میں آیا جو موجودہ بغداد سے حد درجہ مختلف اور اپنی عمارات کی دلکشی' آرائش و زیبائش' ترتیب' حفظانِ صحت کے نظام کی عمدگی' پولیس کی حسن کارکردگی اور سڑکوں کی صفائی ستھرائی و روشنی کے اعتبار سے ایک فقید المثال شہرِ بے مثال تھا۔ بغداد میں اور سلطنت کی تمام حدود کے اندر اگلی تین صدیوں میں اسلامی تہذیب اپنے انتہائی عروج تک پہنچ گئی۔ لیکن ماسوائے ہسپانیہ ہر جگہ ایرانی شان و شوکت نے عربی سادگی و وصف داری کا خاتمہ کر دیا۔ بقول ایک معروف مغربی مصنف تاریخِ عالم کے اس زمانے میں قرطبہ' قاہرہ' بغداد اور دمشق ہی وہ شہر تھے جن میں سڑکوں اور گلیوں میں روشنی کا انتظام اور پولیس کی خدمات حاصل تھیں۔ وہ تعظیم اور طرزِ تخاطب جس کی خلفائے راشدین اور بنی امیہّ نے اہل کفار کی عادت و امتیاز سمجھتے ہوئے ممانعت کی تھی عباسی خلفاء نے اسے نہ صرف اپنے لیے پسندیدہ قرار دے دیا بلکہ اس پر اصرار بھی کیا۔

اسی زمانے میں حرم سراؤں کا رواج شروع ہوا اور عورت نے معاشرہ کے اونچے طبقے میں ایک چالاک اور سازشی عنصر کی حیثیت حاصل کی۔ اس طرح قرونِ اولیٰ میں مسلمان عورت کو جو محترم مقام حاصل تھا اور جو آزادانہ حیثیت حاصل تھی' اس کا خاتمہ ہو گیا۔

اسلام کی توسیع اور عالمگیریت کو ایک ہی فرقہ تک محدود کر دینے کا میلان بھی ظاہر ہوا۔ جس کے مقابلے میں اعتدال پسند مسلمان علماء و فضلاء میدان میں اتر آئے۔ خلفاء نے اس میدان کو پسند کیا کیونکہ اس طرح انھیں وہ مقام حاصل ہو جاتا تھا جو ان کی اصل اسلامی حیثیت سے بہت بالا تھا۔

فارغ البالی کے زمانہ کی طوالت نے عوام کو جنگی ضروریات کے اعتبار سے

بے کار و تساہل پسند بنا دیا تھا۔ بلا شبہ اس سلطنت کی وسیع و عریض سرحدوں میں محدود پیمانے کی جنگیں بھی ہوتی رہیں لیکن جیسا کہ میں اسلامی ضابطۂ جنگ پر بحث کروں گا۔ عوام پر اس طرح کی جنگیں کوئی اثر نہ ڈالتی تھیں۔ ان صاحبِ فہم و بصیرت مسلمانوں نے جنھیں قرآنی فہم و ادارک کی دولت حاصل تھی، اس صورتِ حال کو ناقابلِ اطمینان پاتے ہوئے عوام کو خطرے سے آگاہ بھی کیا۔ لیکن علماء نے جنھوں نے علم و فضل پر سرکاری اجارہ داری قائم کر رکھی تھی، خلفاء کی بے کار خوشامد اور جی حضوریوں سے انھیں اپنے بارے میں باطل قسم کے وہم و اعتقادات میں مبتلا کر دیا۔ انھوں نے عوام میں اس خیال و اعتقاد کا پرچار شروع کیا کہ خلیفہ خداتعالیٰ کا منظورِ نظر اور ظلِ الٰہی ہے۔ وہ اللہ کی امان میں ہے اور اس کی سلطنت تاابد قائم رہے گی۔ سرحدات کی حفاظت جنگجو قبائل بالخصوص ترکوں کے سپرد کر دی گئی اور وہی خلفا کے ذاتی محافظ (باڈی گارڈز) بھی مقرر ہوئے۔ یہ لوگ اپنے برائے نام آقاؤں کے محافظوں کی حیثیت سے نکل کر ان پر پوری طرح سے مسلط ہو گئے۔ یہ لوگ نہایت ذہین وفہیم، سادگی پسند اور قوت و طاقت سے بھرپور تھے۔ انھوں نے ہارون الرشید اور مامون کے تخت پر براجمان ہونے والے لہو و لعب میں غرق کمزور اور بزدل شہزادوں کے خلاف اپنی نفرت و بیزاری کو کبھی چھپانے کی کوشش نہ کی۔ انھوں نے یکے بعد دیگرے ان نکمّے شہزادوں کو انتہائی ذلت و خواری کے ساتھ کبھی موت کے گھاٹ اتارا کبھی تخت سے اتار دیا۔ ان لوگوں کی بدولت اس منہدم ہوتی ہوئی سلطنت میں زندگی کا ایک نیا جوش وولولہ پیدا ہوا۔ انھوں نے سلطنت کے مرکزی صوبہ جات کے انتظام کو بطریق احسن برقرار رکھا۔ اگرچہ اس وقت دور دراز کے علاقوں پر خلیفہ کا اقتدار برائے نام ہی رہ گیا تھا۔ لیکن مسلمانوں کا خلیفہ ہونے کی حیثیت سے وہ مقامی عاملین کے تقرر کی توثیق ضرور کیا کرتا تھا۔ اور عوام کے لیے یہ تقریب ایک مذہبی حیثیت رکھتی تھی۔ ایران نے اپنی خودمختاری کا اعلان کر دیا۔ مصر ایک ایسے خاندان کے قبضے میں چلا گیا جو فاطمی یعنی آلِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے تھے۔ اگرچہ اس زمانے کے سنیوں نے ان کا یہ دعویٰ تسلیم نہ کیا اور انھیں ایک کربلائی یہودی کی نسل سے قرار

دیا۔ اس فاطمی خاندان نے مصر میں اپنی الگ حکومت قائم کر لی اور شام و فلسطین کو دو مرتبہ اور حجاز کو ایک مرتبہ فتح بھی کر لیا۔

خلافتِ عباسیہ کی مدت یوں تو پورے پانچ صد سال ہے لیکن آخری ساڑھے تین صد سال کی برائے نام مدت میں حقیقی اقتدار ترکوں کے ہاتھ میں آ چکا تھا۔ اس سلطنت کا سیاسی وقار ترک امراء پہلے سلاجقہ یعنی طغرل بیگ' الپ ارسلان' ملک شاہ اس کے بعد زنگیوں یعنی عماد الدین' نورالدین پھر ایوبیوں یعنی صلاح الدین' ملک العادل اور ملک الکامل وغیرہ سے وابستہ رہا۔ حکمران تبدیل ضرور ہوتے رہے لیکن غلغلہ عباسی تہذیب ہی کا رہا۔ اس میں اگر کوئی تنزلی رونما ہوئی بھی تو وہ برائے نام ہی تھی اور اسلامی سلطنت کے ہر حصے میں عوام کی حالت بلحاظ تعلیم' صحتِ عامہ' امن و امان اور آزادی اس وقت کی ہر قوم سے بہتر تھی۔

اس زمانے میں اسلامی سلطنت کی اقتصادی خوش حالی مغربی دُنیا کے لیے قابل رشک تھی۔ مغربی اتحاد کی جماعتیں اسلامی دُنیا میں تجارت کی اجازت حاصل کرنے کے لیے آپس میں خوب لڑا جھگڑا کرتی تھیں۔ اس زمانے میں مسلمانوں کی خوش حالی کا ایک ادنیٰ سا اندازہ موجودہ زمانے کے ایک انگریز مصنف کے ایک اقتباس سے ہو سکتا ہے۔ اور یہ مصنف مسلمانوں کا ہرگز ہمدرد یا خیر خواہ نہیں ہے۔ یہ لکھتا ہے:

''ہسپانیہ کی خوش حالی کے باوجود' جس کا آغاز سولہویں صدی میں نئی دُنیا کے ساتھ اس کی بہترین تجارتی حیثیت سے ہوا' اس کی مصنوعات اور ان کے ساتھ اس کی خوش حالی کیتھولک حکمرانوں کے عہد میں زوال پذیر ہو گئی۔ اور یہ زوال اس وقت مکمل ہو گیا جب فلپ سوم کی طرف سے ازابیل کی مذہب کی حمایت میں شروع کی گئی تباہی کی تکمیل ہسپانیہ سے آخری مسلمان کے اخراج سے عمل میں آئی......''۔

غلامی

دوسرے ممالک کا کیا ذکر' اس زمانے میں خود یورپ میں کاشتکاروں کی حیثیت غلاموں جیسی تھی۔ مختلف پیشوں سے متعلق لوگوں کا درجہ بھی معاشرے میں بہت گھٹیا اور

حقیر تھا۔ تاجروں کو خوشامد اور اپنی مالی حیثیت کی بدولت کچھ امتیازی حقوق بھی ملنا شروع ہو گئے تھے۔ لیکن مسلمانوں کے غلاموں کی غلامی پر تو کتنی ہی آزادیاں نثار کی جا سکتی ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان مبارک ہے کہ: ''غلاموں کو بھی اپنے جیسا کھانا کھلاؤ اور اپنے جیسے کپڑے پہناؤ کیونکہ جو غلام صلوٰۃ قائم کرتے ہیں وہ تمھارے بھائی ہیں''۔ آپؐ کے اس فرمان کی تعمیل کا اہتمام کیا جاتا تھا اور احکاماتِ خداوندی کی تعمیل میں شکرانہ کی ہر تقریب کے موقع پر اور بعض شرعی احکامات کی خلاف ورزی کے کفارہ کے طور پر غلاموں کو آزاد کیا جاتا تھا۔ اگر باہمی جنگ و جدل سے مسلمانوں کو نجات مل جاتی اور مالِ غنیمت کے طور پر غلام ہاتھ نہ لگتے تو اسلامی ممالک میں غلامی کا خاتمہ ہو چکا ہوتا۔ لیکن مسلسل اور موروثی غلامی کی کوئی صورت اسلامی ملکوں میں نہ پائی جاتی تھی۔

غلام اور کنیز کی حیثیت گھر کے بیٹے بیٹی جیسی ہوتی۔ وہ اپنے بے اولاد مالکوں کی جائیداد کے وارث ہوتے۔ اس طرز پر مسلمان بادشاہوں کے غلاموں نے سلطنتیں تک وراثت میں پائیں۔ ایسے مسلمان جو اولاد نرینہ سے محروم ہوتے تھے اپنی بیٹیوں کی شادیاں اپنے غلاموں سے کر دیتے تھے۔ اس طرح اپنے خاندان کی عزت و ناموس اس کے تحفظ میں دے دیتے تھے۔ آقا اور غلام کے تعلقات اس قدر خوشگوار تھے کہ آقاؤں کی محبت اور غلاموں کی وفاداری ضرب المثل بن گئی جب آخری زمانۂ جنگ میں مالِ غنیمت میں حاصل ہونے والے غلاموں کی تعداد میں کمی واقع ہو گئی اور غلاموں کی خریداری اکثر مقامات مثلاً کاکیشیا میں' جہاں اس کا صدیوں پہلے سے رواج چلا آتا تھا' محدود ہو گئی تو بہت سے مسلمانوں کو یہ شکایت پیدا ہوئی کہ غلاموں کو آزاد کرنے اور قرآنی احکامات کی تعمیل میں ان سے حسنِ سلوک کرنے کی سعادت سے وہ غلاموں کے مہیا نہ ہونے کی وجہ سے محروم ہو گئے ہیں۔ لیکن اگر ایک طرف یہ دلیل بغیر کسی انقلاب کے غلامی کے انسداد کے اسلامی مقصد سے قطعی لاعلمی کا ثبوت ہے تو دوسری طرف اسلام کے مقصد سے لاعلمی کی انتہا آج بھی یہ ہے کہ میں نے یہی دلیل خود اپنے کانوں سے سوڈان میں بے رحمانہ غلامی کے حق میں پیش ہوتے سنی ہے۔ غلاموں کی تجارت ایک ظلم

نہیں بلکہ ایک حد درجہ بے رحمی اور شقاوت تھی جس کی اسلام میں ہرگز اجازت نہیں۔ میں یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ تمام دنیائے اسلام میں غلامی کے پردہ میں کوئی ظلم و جبر نہ ہوا ہوگا۔ لیکن میں اس قدر ضرور کہوں گا کہ اہل مغرب نے مسلمانوں میں غلامی کے بارے میں جو کچھ کہا اور سمجھا ہے وہ سراسر کذب و افترا ہے۔ جس طرح اسلامی اور عیسائی غلامی میں کوئی مشابہت نہیں اسی طرح اسلامی غلامی کو امریکہ کے بڑے بڑے باغات اور کھیتوں میں سرسبز و شاداب ہونے والی غلامی سے دور کا بھی رشتہ نہیں۔

مساوات

اسلام میں رنگ و نسل کا امتیاز کبھی نہیں رہا۔ مسلمانوں کی منڈیوں' مساجد اور محلات میں کالے اور گورے برابری کی سطح پر اور دلی محبت و خلوص کے ساتھ آپس میں ملتے جلتے تھے۔ اسلام کے بعض مشہور حکمران اور اولیاء سیاہ رنگ کے تھے مثلاً حبشہ کا نجاشی' یمن کا درویش بادشاہ اور مصر کا مشہور تاریخ دان احمد الجبرتی جس نے خدیوانِ مصر کے مورثِ اعلیٰ محمد علی پاشا کا زمانہ دیکھا۔ اگر کوئی شخص اپنے دل میں یہ خیال کرتا ہے کہ اسلامی دُنیا کا کوئی حکمران سفید فام نہیں تھا تو اسے یاد رکھنا چاہیے کہ اہلِ کاکیشیا اور اناطولیہ کے پہاڑی باشندوں کی رنگت' جنھیں ابتداہی سے اسلامی برادری میں شامل ہونے کا شرف و سعادت نصیب ہوئی' اہل یورپ کی رنگتوں سے بھی زیادہ اجلی ہے۔ اسلامی تہذیب میں مرتبے اور دولت کا فرق تو تھا لیکن اس فرق کو مغرب کے موجودہ طبقاتی تفاوت یا ہندستان کی ذات پات کی تمیز سے دور کی بھی کوئی مشابہت نہیں تھی۔

صفائی

اسلامی تہذیب کی ایک اور نمایاں صفت اس کی طہارت پاکیزگی صفائی اور نفاست پسندی ہے۔ جب یورپ ہر طرح کی گندگی اور ناپاکی غلاظت و آلودگی میں لتھڑا ہوا تھا' اس وقت مسلمانوں کے ہر شہر میں نہانے کے لیے حمام' پانی پینے اور کپڑے دھونے کے لیے سرکاری چشمے موجود تھے۔ مسلمان جہاں کہیں بھی پہنچے انھوں نے پاکیزگی

او صاف پانی کی فراہمی پر سب سے پہلے توجہ دی۔ مسلمان اور صفائی ستھرائی نہانا دھونا اور اسلام کچھ اس طرح آپس میں مربوط ہوئے کہ اندلس میں ۱۵۶۶ء میں حمام کا استعمال ممنوع قرار دے دیا گیا۔ کیونکہ اس طرح لوگوں کے دلوں میں اسلام کی یاد تازہ ہو جاتی تھی۔ سیبولی کے ایک مالی کو اپنے کام کے دوران نہانے پر سخت سزا دی گئی۔ میں نے خود اناطولیہ کے ایک یونانی عیسائی کو اپنے ایک ہم مذہب کے بارے میں یہ کہتے سنا تھا۔ ''وہ تو آدھا مسلمان ہے اپنے پاؤں بھی دھوتا ہے''۔ منڈیوں میں فروخت ہونے والی اشیائے صرف اور ذخائر تمام اسلامی شہروں میں حکومت کی زیر نگرانی ہوا کرتے تھے۔ گوشت اور دوسری تمام اشیائے خوردنی گرد و غبار اور مکھیوں سے بچانے کے لیے کپڑے سے ڈھکی ہوتی تھیں۔

سوسائٹی کے مختلف طبقات میں باہم میل جول' نشست و برخاست اور شادی بیاہ عام تھے۔ میں جو کچھ عرض کر رہا ہوں سب آنکھوں دیکھی حقیقت ہے۔ کیونکہ جب مجھے پہلی مرتبہ مصر' شام اور اناطولیہ کی سیاحت کا اتفاق ہوا تو وہ تہذیب اپنے تمام پہلوؤں کے ساتھ وہاں زندہ تھی۔ جب میں مشہور کہانی ''الف لیلیٰ'' پڑھتا ہوں جس کی بہت سی کہانیاں عباسی عہد سے تعلق رکھتی ہیں۔ (اگرچہ اس کے ربط و اشاعت کا کام کئی صدیوں بعد مصر میں تکمیل کو پہنچا) تو میری نگاہوں کے سامنے دمشق' یروشلم' حلب' قاہرہ اور دوسرے اسلامی ملکوں کا وہ نقشہ پھر جاتا ہے جسے میں نے اپنی سیاحت کے دوران گذشتہ صدی کے آخری عشرے میں دیکھا۔ میں نے اس تہذیب کی ہلکی سی جھلک ضرور دیکھی ہے۔ ان اسلامی ممالک میں میں نے افلاس وتنزل کی زندگی کا جو لطف پایا ہے وہ مغرب میں باوجود انتہائی ترقی و خوشحالی اور دولت کی فراوانی کے کہیں نہیں پایا جاتا۔ وہ لوگ زندگی کی سختیوں' دکھوں اور فکروں اور پریشانیوں سے آزاد تھے نہ ہماری طرح زر پرستی ان کا شیوہ تھی۔ نہ موت کا خوف انھیں دامن گیر تھا۔ ان کی باہمی محبت وخلوص' جود وسخا کا کہنا ہی کیا! مسلمانوں کی سلطنت میں کسی شخص کا پڑوسی بھوکا نہ سوتا تھا۔ نہ موسموں کی سختی سے ہلاک ہوتا تھا۔ ان لوگوں کے پاس کچھ ایسی دولت ضرور تھی جس سے یورپ کا

دامن خالی دکھائی دیتا ہے۔

یہ ضرور ہے کہ ان کے پاس تمدن کے ایسے لوازمات نہ تھے جن کی فراوانی پر یورپ کو فخر وغرور ہے۔ مدت دراز بعد مجھ پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ کسی زمانہ میں یورپ کی موجودہ خوش حالی کے ساتھ ان کے ہاں وہ باطنی راحت اور روحانی اطمینان و سکون کی دولت بھی جمع تھی جس پر مجھ رشک آ تا تھا۔ سالہا سال کے مطالعہ اور تقریباً بیس برس کے غور وتفکر کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ مسلمان آدھی شریعت کے احکام کو پس پشت ڈال دینے کی سزا کے طور پر مادی مرفوع الحالی سے تو محروم ہو چکے ہیں لیکن وہ سکون قلب اور روحانی مسرت آج بھی ہر اُس شخص کو حاصل ہو سکتی ہے جو بقیہ آدھی شریعت کے احکام پر کار بند ہو جائے۔

زوال کے اسباب

اب مجھے اجازت دیجیے کہ میں اسلامی تہذیب کے زوال کے اسباب پر بحث کروں۔ ہم نے دیکھا ہے کہ اسلامی تہذیب خلافتِ عباسیہ کے زوال کے بعد ترکی غلاموں کی ہمت و استقلال سے زندہ رہی۔ ترک جب خلیفہ کی ملازمت میں آئے تو ان کی حیثیت غلاموں سے زیادہ نہ تھی۔ لیکن ان کے سرداروں نے جلد ہی ''امیر الامراء'' پھر ''سلطان'' اس کے بعد ''ملک'' کے خطابات حاصل کر لیے۔ دُنیا اس پر حیرت کرتی ہے کہ کس طرح اسلامی تہذیب کی زمامِ اختیار ایک متمدن و مہذب قوم کے ہاتھ سے نکل کر ایک وحشی اور اجڈ قوم کے ہاتھ میں آ گئی اور اس کے باوجود یہ تہذیب نہ صرف صدیوں تک قائم رہی بلکہ مسلسل ترقی بھی کرتی گئی۔ لیکن یہ حیرت بے جا ہے اور لاعلمی پر مبنی ہے۔ یہ حیرت اس وقت رفع ہو جاتی ہے جب ہمیں یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ وحشی پکے مسلمان تھے۔ اگر وہ کسی وقت خلیفہ کی علانیہ تحقیر کا ارتکاب کرتے تھے تو ان کا مقصد منصب خلافت کی بے عزتی و بے ادبی نہیں ہوتا تھا۔ وہ تو صرف ایک نکمّے اور بدقماش انسان سے بدسلوکی کرتے تھے جس کا وجود اور عمل ملتِ اسلامیہ کے لیے باعث ذلّت اور سلطنت اسلامیہ کے لیے باعث ننگ و عار تھا۔

علامہ ابن خلدون نے اپنے مشہور عالم ''مقدمہ'' میں ایک شعر نقل کیا ہے جس کے معنی ہیں ...... ''خلیفہ ایک غلام اور ایک عورت کے ہاتھ میں پنجرے میں بند طوطے کی طرح ہے۔ جو کچھ اسے پڑھایا جاتا ہے وہ وہی دہراتا ہے''۔ خلیفہ اور خلافت ایک چیز نہیں تھے۔ خلیفہ کی بداعمالیوں اور بدحرکات کے باوجود ہر مسلمان بالخصوص ترک سپاہی کے نزدیک مقامِ خلافت کی اہمیت بڑی معزز و محترم تھی۔ اسلامی تہذیب کے دوسرے محافظ علمائے اسلام تھے جن کا ترک سپاہی بے حد احترام کرتے تھے۔ جب ضرورت ہوتی تھی تو اسلامی دُنیا کی پچاس دانش گاہوں کے مندوبین ایک کونسل کی صورت میں جمع ہو جاتے تھے۔ آج کل کے زمانہ کی طرح اس وقت کے علماء برائے نام ہی علماء نہ ہوتے تھے۔ ان کے لیے فقہاء کا لقب مناسب ہے لیکن چونکہ فقہ اس وقت ابتدائی حالت میں تھا اس لیے وہ علماء ہی کہلاتے تھے۔

اسلامی دانش گاہیں

اس زمانے کی اسلامی دانش گاہیں علوم وفنون کا مسلمہ راہنما تھیں۔ اسلامی دانش گاہوں کا نصاب ہر قسم کے علوم پر مشتمل تھا۔ ان دانش گاہوں نے اس زمانے کے حالات کے مطابق ہر قسم کے علوم وفنون کی اشاعت وترقی کو اوجِ کمال کو پہنچا دیا۔ اس زمانے کے حالات اور مشکلات کے پیش نظر وہ دانش گاہیں موجودہ زمانے جیسی ترقی کا مقابلہ تو نہ کر سکتی تھیں۔ لیکن اس حقیقت کا اعتراف ضرور کیا جا سکتا ہے کہ وہ اسلامی دانش گاہیں اپنے زمانے کی بے مثال درس گاہیں تھیں۔ اور ایسے بہترین ادارے سے تھیں جن کا تعلق مذہب سے تھا۔

جرمن پروفیسر جوزف ہیل اپنی مختصر تصنیف ''عرب تہذیب'' میں جس کا کچھ عرصہ ہوا خدا بخش صاحب نے انگریزی زبان میں ترجمہ کیا ہے' ان دانش گاہوں کے متعلق لکھتے ہیں:

''ان دانش گاہوں میں مذہب کو سب سے بڑا مرتبہ حاصل تھا کیونکہ مذہب ہی نے پہلے پہل حصولِ علم کے راستے کھولے تھے۔ تعلیم القرآن' علمِ حدیث اور فقہ کو ان

درس گاہوں میں امتیازی حیثیت حاصل تھی۔ لیکن یہ اسلام ہی کا کارنامہ ہے اور یہ فخر مسلمانوں ہی کے لیے مقدر ہو چکا تھا کہ اسلامی دانش گاہوں نے دوسرے دُنیوی علوم کو حقارت سے نہ دیکھا اور نہ ہی انھیں بے کار قرار دے کر ردّ کر دیا۔ بلکہ اسلام نے ان علوم کو اپنی پاکیزہ درس گاہوں یعنی مساجد میں جو دینیات کے لیے مخصوص تھیں جگہ دی' پانچویں صدی ہجری تک اسلام کی دانش گاہ مسجد کے اندر تھی اور اسلامی میں تعلیم دینے کی مکمل آزادی کا منبع یہی تھا۔ استاد پر امتحان پاس کرنے اور سند پیش کرنے کی کوئی پابندی نہیں تھی۔ جب کوئی شخص کسی مضمون پر مکمل عبور حاصل کر لیتا تو اسے درس دینے کے قابل سمجھ لیا جاتا تھا''۔

اس کے بعد پروفیسر ہیل کہتے ہیں کہ کس طرح معلمین کے درس میں بے حد عالم و فاضل لوگ بھی عام طالب علموں کے ساتھ شریک ہوا کرتے تھے۔ بحث و تحیص پر کوئی قدغن نہ تھی بلکہ اس کی مکمل آزادی تھی۔ اگر کوئی شخص اپنے نکتۂ نظر کی تائید میں دلائل و براہین پیش کرنے سے قاصر رہتا یا اپنے شاگردوں کی تنقید کا معقول و مدلل جواب نہ دے پاتا تو وہ مسجد میں ایک ہی درس کی تکمیل سے پہلے پہلے اس منصب اعلیٰ سے دست بردار ہو جاتا تھا۔

اُس زمانہ کی اسلامی دانش گاہوں کے اساتذہ علم وفن میں یکتا تھے اور انھی مسلمان معلمین کے ذوق و جذبہ کے بدولت آج مغرب علم وفن کا گہوارہ بنا ہوا ہے۔ ان استادوں میں جو علم کیمیا کا ماہر تھا اس نے علم کیمیا میں سنی سنائی باتوں اور لفاظی کو ناقابلِ قبول قرار دیا۔ اس نے کہا کہ ''جب تک کسی امر کی تائید میں دلائل وشواہد پیش نہ کیے جا سکیں اسے قابلِ قبول قرار نہیں دیا جا سکتا۔ جب کوئی شخص اپنے کسی دعوے کا ثبوت پیش کرتا ہے تب ہی ہم اس کا دعویٰ درست تسلیم کرتے ہیں''۔

اس زمانے کے علماء مذہبی جنونی یا انتہا پسند نہ تھے۔ ان دانش گاہوں کے اساتذہ نہایت بلند فکر اور روشن خیال بزرگ تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پاکیزہ تعلیمات پر عمل اور متابعت میں یہی لوگ عوام کی فلاح و آسودگی کے ذمہ دار تھے اور یہی لوگ

قرآنِ پاک کے عطا کردہ حقوقِ انسانی سے انحراف و غفلت پر خلیفہ کر گرفت کرتے تھے۔ اسلامی دانش گاہ کے اساتذہ اور علماء ہی مذہبی انتہا پسندی کو سر نہ اٹھانے دیتے تھے۔ مذہبی اختلافِ رائے کی صورت میں ظلم و تعدی کی خواہش کو دبا دیتے تھے۔ اور دوسرے بے شمار طرائق سے اسلامی تہذیب کو روبہ زوال ہونے سے بچاتے تھے۔ انھوں نے ایسے مسلمان حکمرانوں کو جو غیر اسلامی جنگوں کو اپنی کشور کشائی کا ذریعہ بناتے تھے' مسلمان عوام کو اپنی مدد کے لیے بلانے سے منع کیا۔ یہ علماء ایسے بادشاہوں کو مجبور کرتے تھے کہ وہ صرف اپنے زرخرید غلاموں کی مدد سے جنگ کریں اور اسلامی ضابطۂ جنگ کو مد نظر رکھتے ہوئے دشمنوں کے کھیتوں کو برباد اور مویشیوں کو ہلاک نہ کریں اور نہ ہی ان لوگوں سے کوئی تعرض کریں جو جنگ میں حصہ نہ لے رہے ہوں۔ عوام پر ان علماء کا اتنا گہرا اثر تھا کہ وہ ان بادشاہوں تک کو سزا دیتے' ان سے کفارہ ادا کرواتے اور انھیں توبہ پر مجبور کرتے تھے جو شریعت کی خلاف ورزی کا ارتکاب کرتے تھے۔

چنگیز خان کے تباہ کن حملوں نے جہاں مسلمانوں کی اکثر شاندار دانش گاہوں کو تباہ و برباد کر دیا' وہاں نہایت جلیل القدر علماء کو بھی قبروں میں پہنچا دیا۔ یہ المناک واقعہ اس وقت پیش آیا جب ترک حکمرانوں کا لشکر صلیبی افواج کے مقابلہ کے لیے مغرب منتقل ہو چکا تھا اور سلطنت کی مشرقی سرحدات کی حفاظت کا انتظام کمزور ہو چکا تھا۔ سرحد عبور کرنے کے بعد ہلاکت و تباہی کے اس سیلاب کو روکنے کے لیے کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ اس ہلاکت آفرین سیلاب کی تباہ کاریوں نے مسلمانوں کو یاد دلا دیا کہ انھوں نے عالمگیر فوجی تربیت مہیا نہ کرنے میں شریعت کے ایک واضح حکم کی صریحاً خلاف ورزی کی ہے۔ یہ احساس اس شدت سے عوام کے دلوں میں جاگزین ہو گیا کہ ہر مسلمان نے فوجی تربیت حاصل کرنا اپنے اوپر لازم قرار دے دیا۔ یہ احساس کل تک غالب رہا جب ہماری آنکھوں کے سامنے یورپ نے اسلامی سلطنتوں کو پارہ پارہ کر دیا۔

چنگیز خان کے حملوں کے بعد سلطنتِ اسلامی پھر زندہ ہوئی۔ اس نے ترقی کی اور اس قدر ترقی کی کہ یورپ اس کے خوف سے ایک بار پھر لرزاں و ترساں رہنے لگا۔

یورپ کے اس خوف نے پرانی صلیبی رنجشوں کو پھر سے زندہ کیا اور یوں اسلامی سلطنت کے زوال کا ایک ثانوی سبب پیدا کر دیا۔ میں نے یورپ کی اسلام دشمنی کو عالمِ اسلام کے زوال کا ایک ثانوی سبب قرار دیا ہے۔ کیونکہ مسلمانوں کے انحطاط کے بنیادی سبب کی جستجو تو شریعت یعنی ان قوانینِ فطرت میں ہی کرنی چاہیے جو اقوام و ملک کے راہنما ہیں۔

علماء کی تنگ نظری

اس میں شک نہیں کہ مسلمانوں کی سلطنت اس زمانہ میں ترقی تو ضرور کر رہی تھی۔ لیکن اس ترقی کی بنیاد وہ قوت و طاقت تھی جو اسے ایک پچھلے زمانے میں حاصل ہو چکی تھی۔ ایسے علماء جن کا عمل ''علم حاصل کرو چاہے چین جانا پڑے'' پر تھا اس وقت تک ختم ہو چکے تھے۔ ان کی جگہ اب ایسے لوگ آ چکے تھے جو ''عالم'' جیسے محترم و پرشکوہ لقب کے خواہش مند اور اس احترام و تکریم کے خواہاں تو ضرور تھے لیکن فریضۂ حصول علم کو وہ اسی اسلام کے اندر ہی محبوس سمجھتے تھے جس کا ایک محدود تصور انھوں نے اپنے ذہن میں بٹھا رکھا تھا۔ ان کی فکر و نظر کی کوتاہیوں اور تنگ دامنیوں نے اس عالمگیر' حریت بخش اور راہنما مذہب اسلام کو ایک ایسا معمولی تنگ و محدود مذہب بنا دیا جیسا کہ ہر وہ مذہب بن جاتا ہے جو انسان اور خدا کے مابین کسی دوسرے انسان کو بطور وسیلہ یا واسطہ تسلیم کر لیتا ہے۔ وہ اسلام جس نے دُنیا کو فکری آزادی عطا کی' وہ اسلام جس نے پادریوں' پروہتوں اور کاہنوں کی غلامی سے جو خدا اور بندے کے درمیان ایک ظالمانہ رکاوٹ بنے بیٹھے تھے' نجات دلائی۔ وہ اسلام جس کے فیوض و برکات نے انسان کو انسان کی غلامی سے ہمیشہ کے لیے نجات دلا دی' خدا ہماری بخشش اور مغفرت فرمائے۔ ایسے غلط کار اور گم راہ علماء کے استیلا کا شکار ہو چکا تھا۔ طبیعات کا ذوق تو پہلے ہی ختم ہو چکا تھا۔ ان علماء نے ان تمام علوم کو جو اہل مغرب سے حاصل کیے جا سکتے تھے' کافرانہ قرار دے کر مسلمانوں کو ان سے متنفر کر دیا۔ حالانکہ پہلے مسلمان علم کے حصول میں خواہ وہ کافروں سے ہی کیوں نہ حاصل ہوتا ہو چین کے سفر پر بھی آمادہ رہتے تھے۔ اس آئینِ جہالت ورعلم دشمنی کے ساتھ ساتھ ان علماء کے غرور و تکبر اور خود بینی اور خود پسندی میں بھی

اضافہ ہوتا گیا۔

وہ مسیحی اقوام جنھوں نے مسلمانوں کے ذوق کی تقلید میں علومِ سائنس پر توجہ دینی شروع کی، مادی ترقی کے میدان میں اس طرح اتنی دور نکل گئیں جس طرح اس سے پہلے سے مسلمان مادّی ترقی کے میدان میں بہت دور تک پہنچے ہوئے تھے۔ جب انھوں نے شریعت کے اس حصہ پر عمل کیا جو فکری آزادی کا عام اعلان کرتا اور حصولِ علم اور تخلیقِ کائنات کے مطالعہ کی دعوت و ترغیب دیتا ہے۔ مسیحی اقوام نے پادریوں اور تنگ نظر مذہبی انتہا پسندوں کی غلامی کا جواء اپنی گردنوں سے اتار پھینکا اور آزادیٔ فکر کی نعمت سے فیض یاب ہوئیں تو ان کی مادی ترقیاں ایسی ہی تحیّر کن تھیں جیسے کہ قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کی شان دار فتوحات---

علماء کی صداقت پسندی

میں اس سلسلے میں کچھ کہنے سے پہلے اسلام کے عالمگیر تصور سے متعلق ایک مثال پیش کرنا چاہتا ہوں۔ یہ مثال اس زمانے سے متعلق ہے جو اسلامی تاریخ میں سیاہ دور، کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس کا ذکر ''کتاب الفخری'' کے پہلے باب میں موجود ہے۔ جہاں مصنف اسلامی شریعت کی رو سے حکمران میں عدل و انصاف کی خوبی کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتا ہے۔ ''جب ہلاکو خان نے بغداد پر قبضہ کر لیا اور بے بس و بے دست و پا خلیفہ اس کی قید میں آ گیا تو اس نے تمام علماء کو مستنصریہ میں جمع کیا اور ان سے یہ سوال پوچھا۔ ''شریعت کی رو سے ایک بے انصاف مسلمان حکمران بہتر ہے یا ایک کافر مگر انصاف پسند حکمران؟'' اس کا جواب علماء نے ایک فتویٰ کی صورت میں دینا تھا اور اسی پر ہی خلافت کی قسمت کا فیصلہ منحصر تھا۔

علماء حیرت زدہ تھے کہ اس سوال کا کیا جواب دیں۔ اس موقع پر اس زمانے کے مشہور عالم، عالم رضاء الدین علی بن طواس اٹھے اور ایک پرچے پر اس سوال کا جواب تحریر کیا'' کافر مگر انصاف پسند حکمران'' اور اپنے دستخط ثبت کیے۔ دوسرے تمام علماء نے بھی اسی جواب پر مہرِ تصدیق ثبت کی۔ ان سب کا اعتراف تھا کہ یہی درست جواب ہے۔

جب اللہ کے رسولؐ نے اس بات کا اعلان کر دیا ہے کہ اللہ کے ہاں سب ایک ہی پیمانے یعنی پیمانۂ انصاف سے ناپے جائیں گے تو مسلمان مومن و کافر کے لیے علیحدہ علیحدہ معیار کیسے روا رکھ سکتا تھا۔ اللہ کا پیمانہ اور اس کا فیصلہ تمام بندوں کے لیے ایک ہی ہے۔ کسی خاص قوم یا فرقہ سے اسے کوئی محبت نہیں۔ اللہ کے مخصوص بندے وہ ہیں، کوئی ہوں، کہیں ہوں، جو احکاماتِ الٰہی پر عمل پیرا ہیں۔ خاص شعائر کی پابندی یا مخصوص اعتقادات پیمانہ نہیں ہیں۔ یہ کوئی ایسی چیز نہیں جو کسی منتر کی طرح دہرائی جائے یا عمل میں لائی جائے اور جس کی بدولت انسان کے گناہ جھڑ جاتے ہوں۔ معیار، عمل ہے۔ فرد و قوم دونوں کے لیے نیک اعمال کا نتیجہ اچھا اور برے اعمال کا برا ہے۔ یہی اسلام کی تعلیم ہے۔ اور اس تعلیم کی صداقت و سچائی اس سے زیادہ مضبوطی اور پختگی کے ساتھ کبھی بھی ایسی نمایاں نہیں ہوئی جیسی کہ اسلامی تہذیب کے عروج و زوال کی تاریخ میں۔

خلافت عثمانیہ اور ترکوں کے کارنامے

آخری عباسی خلیفہ اور اس کے خاندان کی ہلاکت کے بعد کچھ عرصہ تک منگول فاتحین نے مغربی ایشیاء پر اپنا تسلط جمائے رکھا۔ لیکن اس تسلط کو ایک نسل سے کم مدت بھی نہ گزرنے پائی تھی کہ ایران میں سر اٹھانے والے فتنوں کے سبب منگولوں کو واپس لوٹنا پڑا۔ ترک سرداروں نے اپنی مملکتیں نئے سرے سے سنبھال لیں۔ سلطانِ قونیہ نے ان مملکتوں کو اپنی پہلی سے ماتحت حیثیت میں لانے کی کوشش کی لیکن اسے ناکامی ہوئی۔ اسی دور میں عثمانی ترک نمودار ہوئے۔

عثمانی ترکوں کا عروج جس نے اسلامی سلطنت کو بلحاظ وسعت و استحکام اپنے عروج پر پہنچا دیا خاندانِ تیموریہ سے قریبی مشابہت رکھتا ہے۔ عثمانی سلطنت اپنے عروج کے زمانے میں شان و شوکت، عظمت و سطوت کے لحاظ سے اکبر، جہانگیر، شاہ جہان اور اورنگ زیب کی سلطنت سے کسی طور کم نہ تھی۔ اسی زمانے میں تیسری اسلامی زبان نے، جو کلی طور پر اسلامی زبان ہونے کے باوجود مکمل طور پر ترکی بھی تھی، ایک انمول ادب پیدا کیا۔ ترکی ادب اپنی دل نشینی اور لطافت کے لحاظ سے اپنی مثال آپ ہی ہے۔ ترکی

ادب کی بنیاد ایک خوب صورت لیکن مشکل زبان پر استوار ہے۔ غالباً ترکی زبان کی یہی مشکل زمانۂ حال کی مستشرقین کی بے اعتنائی کا سبب ہے۔ عثمانیوں کے دورِ عروج و عظمت میں مساجد اور محلات کے ایسے ایسے بے مثال و شاندار نمونے معرضِ وجود میں آئے جو صدیاں گزر جانے کے باوجود آج بھی فنِ تعمیر میں ان کی شوکت وسطوت کی کہانیاں سناتے ہیں۔

اسی زمانے میں اسلامی علوم کے ماہرین جو ایک برباد شدہ اور لٹے ہوئے قافلۂ علم وفضل کی یادگار بن چکے تھے' گروہ درگروہ بروصہ' ایڈریا نوبل اور استنبول پہنچتے رہے۔ یہ تینوں شہر یکے بعد دیگرے ترکانِ عثمانی کے دارالحکومت رہے ہیں۔ ترکی سلاطین جن میں سے اکثر بلند پایہ شاعر اور علوم وفنون کے مربی تھے' ان علماء و ماہرین کی سرپرستی کرتے تھے۔

ترکی زبان کی شاعری میرے لیے خاص دل کشی اور کشش لیے ہوئے ہے۔ ترکی شاعری میں قدرتی سوز وگداز ہے۔ اور ایک ایسی قوم کے ادب میں جسے زندگی کے ہر موڑ پر صدیوں تک ہلاکت وتباہی کا سامنا رہے' اور کس چیز کی تلاش وجستجو کی جائے؟ لیکن ترکی شاعری محض رنج والم کا نام نہیں نہ یہ یاس انگیز ہے۔ بلکہ اس میں ترکی قومی خصوصیات کی مناسبت سے فطرت کے لیے ایک قابلِ ستائش ذوق نمایاں ہے۔ ترکی ادب کے اعلیٰ ترین نمونوں میں چینی ادب کی طرف' جس سے میں بذریعہ تراجم متعارف ہوا ہوں' ایک میلان پایا جاتا ہے۔ اگر مجھ سے دریافت کیا جائے کہ ترکوں نے اسلامی تہذیب کو کیا تحفہ دیا ہے تو میں کہوں گا۔ ''اپنی خانگی زندگی کی پرمسرت دل کشی'' پہلی جنگِ عظیم سے قبل ان کی خانگی زندگی میں وہی شرافت وہی وقار پایا جاتا تھا جو ان کی شاعری کا نمایاں وصف ہے اور جو ہر اس قوم میں پیدا ہو جاتا ہے جو ہر لمحہ کسی مقصدِ اعلیٰ کے لیے شمشیر بکف رہے۔ اور کون نہیں جانتا کہ ترکوں نے اپنی جانیں کس شانِ استغناء کے ساتھ نثار کیں اور ان کی عورتوں نے انتہائی رنج والم میں کس صبر واستقلال کا مظاہرہ کیا اور کس قوتِ برداشت کا نمونہ پیش کیا۔ ان کی زندگی میں ان کے ہر عمل میں ایک

شان اور سلیقہ دکھائی دیتا ہے۔ دُنیا کی کونسی قوم ہے جو ترکوں کی ان خوبیوں اور کمالات پر رشک نہ کرتی ہو؟

عثمانی ترک اوّل درجے پر--- بہترین سپاہی تھے۔ دوسرے درجے پر وہ شاعر تھے۔ تیسرے درجے پر وہ سیاست دان تھے۔ اور چوتھے درجے پر وہ دینیات کے عالم تھے۔ اگر انھوں نے مذہب کے معاملے میں دوسروں پر اعتبار کیا تو اس میں ان کا کوئی قصور نہ تھا۔ مذہب کی زبان عربی تھی اور اس پر صرف علماء ہی کو عبور حاصل تھا۔ اگر چہ قرآنِ پاک کی ایسی تلاوت بھی جس میں ترجمہ وتفسیر شامل نہ ہو باعثِ خیر و برکت سمجھی جاتی تھی۔ ترکوں کا پیشہ سپاہ گری تھا اور اس کا یہ انداز زندگی کے ہر پہلو میں دکھائی دیتا تھا۔ ترک اپنے روحانی راہنماؤں پر اس طرح اعتقاد رکھتے تھے جیسا کہ اپنے فوجی راہنماؤں پر۔

عام ترک زمانۂ زوال میں بھی زمانہ عروج کی طرح مطمئن تھے۔ زوال تدریجاً اور غیر محسوس طریقے سے آتا گیا اور اس کا سب پر یکساں اثر ہوا۔ چونکہ دورِ زوال میں بھی عہدِ عروج و ترقی کی تمام شان شوکت بظاہر طور پر موجود تھی۔ اِس لیے ترکوں کے لیے اپنے زوال کا مکمل احساس کسی دھچکے کا محتاج رہا۔

سلطنت میں ابتدائی اور ثانوی مکتب بھی موجود تھے۔ دانش گاہیں بھی قائم تھیں۔ مکتبوں کا کام قرآنِ حکیم کے معنی و مفہوم سے ناواقف صرف تلاوت کے لیے مسلمانوں کو تیار کرنا تھا۔ دانش گاہیں فقیہانہ بحث کی جگہیں بن چکی تھیں۔ فقہ کی تعلیم بلاشبہ ہر مسلمان کے لیے فائدہ مند تھی۔ لیکن اس زمانے کی مروج تعلیم نے اسے عقل و ہوش کی راہزن بنا کر رکھ دیا تھا۔ عدالت' حفظانِ صحت' پولیس' رفاہ عامہ کے محکمہ جات تو سب موجود تھے لیکن ان کی استعداد کار غیر تسلی بخش ہو چکی تھی۔ ترکوں کو موجود زمانے میں اپنے زوال کا احساس اس وقت ہوا جب یورپی حکومتوں نے ترکی کی عیسائی رعایا کے لیے بہتر حالات مہیا کرنے کے لیے مداخلت کا آغاز کیا۔ ترکوں کو اپنے فوجی نظام کی کمزوری اور فرسودگی کا احساس اس وقت ہوا جب ایک عہدِ حاضرہ کی تربیت یافتہ چاک

و چوبند فوج سے ان کا محاربہ ہوا۔ ترکوں کے جوش و جذبہ اور معاملہ فہمی کا ہم اعتراف کیے بنا نہیں رہ سکتے جب ہم دیکھتے ہیں کہ ترکوں نے اپنے زوال کے احساس کے بعد اس کی تلافی کی ہر ممکن کوشش کی۔

اِسلام کے زمانۂ انحطاط میں ترک اگر ایک ناسمجھ راہنما تھا تو احیائے ملّت کی جدوجہد میں اس کی حیثیت ایک دانائے راز قائد کی ہے۔ گذشتہ نصف صدی کا ترکی ادب پرانے ترکی ادب سے بے حد مختلف ہے۔ جدید ادب میں اگر ایک طرف نامق کمال اور اکرم کے سرور انگیز نغمات ہیں جو وطن پرستی کے جذبات کو انگیخت کرتے ہیں تو دوسری طرف پرنس سعد حلیم پاشا کی تصنیف ''اسلام لشمق'' یعنی اسلامی بنالو' بھی نظر آتی ہے۔ جس میں شرعی اصولوں کو عہدِ حاضر کی زبان اور ضرورت کے سانچے میں ڈھال کر پیش کیا گیا ہے۔ سعد حلیم کی تشریح و توضیح ملّاؤں کے مسلک سے الگ چیز ہے۔ ترکی کا موجودہ ادب ترقی پسند اور قائدانہ ہے۔ یہ ادب باوجود ان صبر آزما اور قیامت خیز ہنگاموں اور کشاکشوں کے' جن سے ترکوں اور ان کی اسلامی سلطنت کو گزرنا پڑا' مستقبل کے لیے ایک امید کا پیغام ہے۔

غازیوں اور مجاہدوں کی آج بھی وہاں بڑی عزت و تکریم کی جاتی ہے۔ شہادت آج بھی جنت میں داخلے کی امید سمجھی جاتی ہے۔ لیکن ترکی میں آج کل جس جہاد کا چرچا ہے وہ ایک ٹوٹتی بکھرتی ختم ہوتی سلطنت کے بقا کے لیے نہیں بلکہ وہ آزادی' ترقی' اخوت اور اطاعتِ الٰہی کا جہاد ہے۔

ترکی کا انقلاب اسلام کے احیائے نو ایک دیباچہ تھا حس کے دل کش اثرات دُنیائے اسلام کے گوشے گوشے میں پھیل چکے ہیں۔ اب ہر شخص پر یہ حقیقت منکشف ہورہی ہے کہ اسلام کے انحطاط کا سبب ایک علم دشمن اور فہم وشعور سے محروم ملائیت تھی۔

مسلمانوں کو تلاشِ علم کے لیے نکلنا چاہیے چاہے چین ہی کیوں نہ جانا پڑے۔ شجرِ اسلام اپنی شادابی و بالیدگی کے لیے علم و روشنی' کا طلب گار ہے۔ جہالت اور ضلالت اس کے لیے موت اور ہلاکت ہے۔

اخوت

میرے آج کے خطبے کا موضوع اسلامی اخوت ہے۔ میں اس پر ایک آئین اور نصب العین کی حیثیت سے اظہارِ خیال کرنا چاہتا ہوں۔ اس موضوع کے آغاز ہی میں میں قرآن پاک کی اس موضوع پر بے شمار آیات میں سے دو آیات کا حوالہ دوں گا۔ وہ آیاتِ شریفہ ہیں:

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا ۚ وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا كَذٰلِكَ یُبَیِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰیٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝ (آل عمران ۳: ۱۰۲-۱۰۳)

اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو۔ اللہ کے ساتھ اپنے فرائض کو پورا پورا خیال رکھو۔ اور نہ مرو اس حال میں کہ تم مسلم نہ ہو۔ تم سب اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑو اور آپس میں تفرقہ نہ ڈالو۔ اپنے اوپر اللہ کی مہربانی کو یاد کرو جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ اس نے تمھارے دلوں کو جوڑا۔ اور تم اس کی مہربانی سے آپس میں بھائی بھائی بن گئے۔ تم آگ میں گڑھے کے کنارے تھے۔ اس نے تم کو اس سے بچایا۔ اس طرح اللہ تمھیں اپنی آیات کھول کر بتاتا ہے تاکہ تم ہدایت پاؤ۔

قرآن پاک کی ان دو آیات میں ایک طرف طلوعِ اسلام کی برکات سے تھوڑے ہی عرصے میں جو ترقی ہوئی وہ یاد دلائی گئی ہے۔ دوسرے طرف تمام مسلمانوں کے لیے ایک حکم ہے کہ اللہ کی رسّی یعنی شریعت کو مضبوطی سے تھامے ہوئے ترقی کے راستے پر گامزن رہیں۔ اور دوبارہ ایسی صورت حال کو سر اٹھانے سے پہلے ہی کچل دیں جس نے عرب میں قبائل اور گروہوں کی باہمی جنگ و جدل کے ہاتھوں انسانی تہذیب کی مکمل تباہی و بربادی کا سامان پیدا کر دیا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے:

''مسلمان ایک دیوار ہیں۔ جس کی ہر اینٹ ایک دوسرے کو سہارا دیئے ہوئے ہے۔ ملّتِ اسلامیہ ایک جسم کی طرح ہے۔ اگر اس جسم کی آنکھ میں تکلیف ہو یا اس کے پاؤں میں کوئی کانٹا چبھ جائے تو تمام جسم کا درد و کرب اور بے چینی و اضطراب میں مبتلا ہو جانا یقینی امر ہے''۔

حجۃ الوداع

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے میدانِ عرفات میں ان لوگوں کے ایک عظیم مجمع کے سامنے جو چند ماہ یا چند سال پہلے ایسی بت پرستی اور جہالت میں مبتلا تھے جس نے انھیں بے ضمیر بنا دیا تھا' ایک شاندار اور دل نشین خطبہ دیا۔ آپ نے فرمایا:

''اے لوگو! میری باتیں خوب ہوش و گوش سے سن لو اور سمجھ لو۔ کیونکہ میں نہیں جانتا کہ اس کے بعد پھر کبھی اس موقع اور اس مقام پر میں تمھارے درمیان موجود ہوں گا۔ تمھارے جان و مال اور آبرو ایک دوسرے کے لیے اسی طرح واجب الاحترام ہیں جیسا کہ یہ مہینہ یہ دن اور یہ شہر۔ جان رکھو کہ تمھیں اللہ تعالیٰ کے روبرو حاضر ہو کر اپنے اعمال کی جواب دہی کرنی ہوگی۔

اللہ تعالیٰ نے ہر حق دار کو وراثت کی رو سے اس کا حق دے دیا ہے۔ اب کسی وارث کے حق میں وصیت جائز نہیں۔ بیٹا اس کا ہے جس کے بستر پر وہ پیدا ہوا ہے۔ زانی کے لیے کنکر پتھر ہیں۔ اور اس کا حساب اللہ کے ذمے ہے۔

جو بیٹا اپنے باپ کو علاوہ کسی اور کے نسب سے ہونے کا دعویٰ کرے۔ اور جو غلام اپنے آقا کے سوا کسی اور طرف اپنی نسبت کرے۔ اس پر اللہ اور اس کے فرشتوں اور تمام بنی نوعِ انسان کی لعنت ہوگی۔

اے لوگو! تمھاری بیویوں پر تمھارے اور بیویوں کے تم پر حقوق ہیں۔ اپنی حیثیت کے مطابق انھیں اچھا کھلاؤ پہناؤ اور ان سے نرمی خوش اخلاقی اور حسن سلوک سے پیش آؤ۔ کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمھارے پاس امانت ہیں۔ اور اس کے حکم سے تم پر حلال کی گئی ہیں اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حدود کا احترام کرو۔ اور ان سے تجاوز مت کرو۔

سود کو باطل قرار دیا گیا ہے۔ قرض لینے والا صرف اصل رقم ہی واپس کرے گا اور میں سب سے پہلے اپنے چچا عباسؓ کا سود باطل قرار دیتا ہوں۔ تمھارے جو غلام ہیں ان کو وہی کھلاؤ جو خود کھاتے ہو۔ اور انھیں وہی پہناؤ جو خود پہنتے ہو۔ اگر ان سے کوئی ایسا قصور سرزد ہو جائے جو ناقابلِ معافی ہو تو ان کو علیحدہ کر دو۔ کیونکہ وہ بھی تمھاری ہی طرح اللہ کے بندے ہیں۔ ان سے بدسلوکی نہ کرو۔ جاہلیت کے تمام خون باطل قرار دے دیئے گئے ہیں۔ سب سے پہلے میں اپنے خاندان کی طرف سے ربیعہ بن الحرث کے بیٹے کا خون باطل کرتا ہوں۔ اے لوگو! اچھی طرح سے سن لو اور سمجھ لو کہ سب مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ عربی کو عجمی پر عجمی کو عربی پر کوئی فوقیت نہیں مگر تقویٰ کے سبب۔ تم سب آدمؑ کے بیٹے ہو اور آدمؑ مٹی سے بنے تھے۔ مسلمان سب بھائی بھائی ہیں۔ کسی شخص کو دوسرے کا حق نہ مارنا چاہیے۔ تم اپنے آپ کو ظلم اور بے انصافی سے بچائے رکھو۔

جو لوگ یہاں موجود ہیں وہ یہ پیغام ان لوگوں تک پہنچا دیں جو یہاں موجود نہیں''۔

اس خطبہ کے اختتام پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کثیر التعداد حاضرین کے جوشِ عقیدت پر خوش ہوتے ہوئے' جو چند سال یا چند ماہ پہلے دشمنانِ اسلام تھے'

فرمایا:

اے اللہ میں نے تیرا پیغام تیرے بندوں تک پہنچا دیا۔ میں نے اپنی امانت ادا کر دی"۔ اس ارشادِ مبارک کے جواب میں ہزاروں آوازیں بلند ہوئیں۔

"ہاں یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ نے اپنی امانت ادا کر دی"۔

اس پر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی انگشتِ مبارک آسمان کی طرف اٹھاتے ہوئے کہا:

"اے خدا تو گواہ رہیو!"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اصولوں کی محض تعلیم و تلقین ہی کو کافی نہیں سمجھا بلکہ خود بھی ان پر عمل کر کے دکھایا۔ اگرچہ آپؐ درحقیقت عرب کی بادشاہت حاصل کر چکے تھے۔ لیکن اس پر بھی آپؐ نے نہ ہی کسی شاہی تخت کو رونق بخشی نہ کوئی شاہی فرامین صادر فرمائے۔ آپؐ اپنی ملّت کے ایک فرد تھے اور آپؐ کی قائدانہ حیثیت ایک ایسے لیڈر کی تھی جو اپنی تعلیمات پر خود عمل پیرا ہو کر دوسرے کے سامنے نمونہ پیش کرے۔ جب آپؐ نے اسلامی اخوت کا اعلان فرمایا تو اپنے آپ کو اس سے ہرگز مستثنیٰ قرار نہیں دیا۔ آپؐ سب مسلمانوں کے بڑے بھائی تھے اور ہیں۔ غرض یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسلامی تعلیمات کا جیتا جاگتا پیکر تھے۔

اخوت کے بارے میں مسلمانوں کو کسی دوسرے مذہب' عقیدہ یا قوم سے کسی قسم کے معذرت خواہانہ رویہ یا شرمندگی کی ضرورت نہیں۔ مسلمان آج کل کے زمانے میں بھی اخوت سے متعلق اپنے کارنامے اور کمالات مثال کے طور پر پیش کر سکتے ہیں۔ دوسرے مذاہب کے ماننے والے ربوبیت۔ الٰہی اور اخوت کے اعلانات تو ضرور کرتے ہیں لیکن یہ اعلانات و اعتقادات ایک غیر مطمئن اور کش مکش میں مبتلا دُنیا کے لیے کبھی کسی عملی فائدے کے موجب ثابت نہیں ہوئے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ دوسری اقوام کے اس نظریے نے مصائب و آلام میں مبتلا دُنیا کی عملی امداد سے ایسی بے رحمانہ بے اعتنائی برتی ہے کہ اس کے دکھوں اور مصائب کے مارے انسانوں نے مذہب کو ایک ظلم و جبر سمجھتے

ہوئے مذہب ہی کے خلاف بغاوت برپا کر دی ہے۔ اور اپنا عقیدہ ان انسانیت پرست اصولوں پر استوار کر لیا ہے جو ایک غلط مماثلت کی بنیاد پر کفر والحاد سے وابستہ ہیں۔ کفر والحاد کے ان نئے بتوں کو دُنیا ''آزادی'' ''مساوات'' اور ''اخوت'' کے دل کش ناموں سے یاد کرتی ہے۔ اور انسانیت کارل مارکس کے غیر الہامی صحیفہ کا شکار ہو گئی ہے۔

آزادی مساوات اور اخوت --- ان میں سے کون سی چیز قابل عمل ہے؟ انسانی معاشرے میں آزادی اور مساوات ہمیشہ محض اضافی حقائق ہی رہیں گی۔ کیونکہ ان کا مکمل طور پر ظہور پذیر ہونا ممکن نہیں ہے۔ کسی فرد یا قوم کی آزادی ہمسایہ افراد اور اقوام کی آزادی سے محدود رہے گی۔ آزادی و مساوات کے مفہوم کا تعین بھی بے حد مشکل ہے۔

اخوتِ اسلامی

انسانی حقوق کو انسانوں کے وجود سے الگ کوئی چیز سمجھ لینا اسلامی نقطۂ نظر سے قطعاً غلط بات ہے۔ انسان حقوق شکمِ مادر سے ساتھ نہیں لاتا۔ انسان عطیات اور شعور قدرتی طور پر ساتھ لاتا ہے۔ معاشرے میں حقوق عطیات کے استعمال اور خواہشات کے کھلنے سے پیدا ہوتے ہیں اور فرائض کے مطابق متعین ہوتے ہیں۔ خارج میں ان کا کوئی وجود نہیں۔ تمام انسانوں کے لیے ہر قسم کی مساوات کا مطالبہ بھی انتہائی نا معقول ہے اور اس پر عمل درآمد کی کوشش انسانیت کو بے دست و پا کر دینے کے مترادف ہے۔ تمام افراد کے لیے ہر قسم کے مساوات کا مطالبہ ایسا ہے جس نے دُنیا میں بڑے پیمانے پر اختلاف رائے پیدا کر رکھا ہے۔ جس پر دُنیا بحث و تکرار ہی نہیں جنگ و جدل پر بھی آمادہ ہے۔ اگر ایک شخص برطانوی دستور میں اپنی منتہائے آزادی کی صورت دیکھتا ہے تو دوسرے شخص کو اپنی نجات روسی دستور میں دکھائی دیتی ہے۔

آج آزادی اور مساوات کے لیے ایک عالمگیر جنگ چھڑی ہوئی ہے۔ جس کے جوش و جذبہ میں اخوت کو اس وجہ سے فراموش کیا جا رہا ہے کہ وہ معدوم ہوتی جا رہی ہے۔ حالانکہ اخوت اس وقت بآسانی حاصل کی جا سکتی ہے جب نیک نیتی اور خیر خواہانہ جذبے کے تحت ایک ضابطۂ قوانین کو مذہبی پابندی کے ساتھ اپنے اوپر لازم کر لیا جائے۔

لیکن اگر آپ کو اخوت کے عملی وجود کی جستجو ہے تو نہ ہی گذشتہ علمی تاریخ میں اس کی کوئی مثال ملے گی اور نہ ہی موجودہ دُنیا میں یہ لفظ آپ کو تصویرِ عمل بنا دکھائی دے گا۔ اگر دُنیا نے اخوت کو کبھی کہیں پایا ہے تو دامنِ اسلام ہی میں پایا ہے۔ ان حالات میں مجبور ہو کر انسان اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ انسانی برادری کی صورت میں کسی جمہوریت کا قیام الٰہیت کے اقرار اور اعتراف کے بغیر ممکن نہیں بنی ناصرہ نے انسانی برادری کا ایک مقصد پیش کیا۔ جس کی بنیاد عملی طور پر اس الٰہیت پر ہے جو یہودیوں میں رائج تھی۔ اس لیے اس پر کبھی عمل نہیں ہوا۔ کیونکہ الٰہیت مسیحیت میں معاشرے کی بنیاد تو درکنار نظامِ حکومت تک کی بنیاد بھی نہیں بنی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تاریخِ عالم میں سب سے پہلے انسانی برادری کا اعلان ہی نہیں فرمایا بلکہ اس پر معاشرے کی بنیاد بھی قائم کی اور اسے ایک بنیادی اور عملی قانونِ زندگی کا درجہ عطا کیا۔ حقیقی انسانی ترقی کی بنیاد اخوت یا بھائی چارہ ہی ہے اور اسلام کے تمام قواعد کا رخ اسی کی طرف ہے۔ معاشرتی امتیازات قائم رہے اور انفرادی آزادی پر وہ پابندیاں بھی قائم ہیں جن کا وجود ایک منظم جماعت میں ناگزیر ہے۔ لیکن اسلام نے افراد اور اقوام میں کردار و اخلاق' حیثیت و مرتبہ' جاہ و ثروت' اقتدار و اختیار کے قسم قسم کے اختلافات کے باوجود پائیدار و مستحکم برادرانہ تعلقات قائم کر دیے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے: ''جو غلام نماز پڑھتے ہیں۔ تمھارے بھائی ہیں''۔ اور صرف زبانی کہی ہوئی باتیں نہ تھیں۔ غلاموں کے ساتھ مسلمانوں نے واقعی بھائیوں جیسا سلوک کیا۔ اقوامِ عالم کے باہم ربط و ملاپ سے بھی ایک اسلامی برادری اور ملّت پیدا ہوئی۔ جو اللہ تعالیٰ کے فضل سے آج بھی اپنا وجود رکھتی ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمان اقوام کے دلوں سے کٹر قوم پرستی کے جذبات کو اپنے اس ارشاد پاک سے مٹا دیا کہ: ''وہ ہم میں سے نہیں جو ظلم میں اپنے قبیلے کا ساتھ دیتا ہے۔ اور وہ بھی ہم میں سے نہیں جو دوسروں کو بھی اس ظلم میں شامل ہونے کی دعوت دیتا ہے۔ وہ بھی ہم میں سے نہیں جو اپنے قبیلے کی ظلم میں مدد کر رہا ہو اور

اس حالت میں موت اسے آن لے''۔

اسلام نے ایک ایسی عالمگیر ملت کی بنیاد مستحکم کی جس کی بدولت مسلمانوں میں محدود اور فرو تر قومیت کا احساس ختم ہو گیا۔ اسی کی بدولت انھیں اپنے ملک کے لیے بے کار قسم کی جنگوں میں الجھنا زمانۂ جاہلیت کی ایک برائی دکھائی دینے لگا۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی ارشاد فرمایا: ''راہِ حق پر چلنے والا حبشی غلط راہ پر چلنے والے قریشی سے فرمانروائی کا زیادہ حق دار ہے''۔ حسب ونسب' مال ودولت اور قوت و اقتدار کے مقابلے میں خدمتِ ملت اور خدمتِ خلق کو قوم کی طرف سے عزت و احترام کی کلید قرار دیا گیا ہے۔

ارشاد گرامی ہے: ''دوسروں سے ایسا ہی سلوک کرو جیسے سلوک کی تم ان سے توقع رکھتے ہو''۔ فاتر العقل اشخاص کو اس اصول کی سچائی اور صداقت کا کیسے قائل کیا جا سکتا ہے۔ بیشتر لوگ اس طرح کی معاشرتی سچائیوں کو ذاتی مفاد کی وجہ سے سمجھنے سے قطعاً عاری ہوتے ہیں۔ سوائے اس صورت میں کہ ان پر وہ حالت ہو سکے جو ان کے مظالم کے وجہ سے دوسروں کی ہوتی ہے۔ اس لیے اسلام نے قصاص کے قانون کو استواری عطا کی جسے بعض لوگ بعض پہلوؤں سے بے رحمانہ سمجھتے ہیں۔ قصاص کا قانون' جیسا کہ مسلمانوں کو اس کی تعلیم دی گئی ہے' ظالمانہ نہیں۔ کیونکہ انھیں قصاص کو جرم کی نوعیت سے بڑھا لینا منع ہے۔

مسلمانوں کو سزاؤں کو معیاری بنانے یعنی دوسروں کو خوف اور عبرت دلانے کے لیے کسی مجرم کو اس کے جرم کی نسبت سے زیادہ سزا دینے کی بھی سختی سے ممانعت ہے۔ ''حیف ہے تم پر اگر تم ایک جنگلی کتے کو بھی عبرت ناک یا معیاری سزا دو''۔ قصاص میں سچا انصاف ہی سزا کی ایک صورت ہے۔ جو بنی نوعِ انسان کے لیے ایک حقیقی قدر قیمت کا سامان ہے۔

احکاماتِ خداوندی جیسے کہ وہ قرآنِ پاک میں درج ہیں۔ صرف اس اصول کی صراحت وتشریح ہیں کہ دوسروں کے ساتھ ایسا سلوک کرو جس کی تم ان سے اپنے لیے

توقع رکھتے ہو۔ یہ اصول اسلامی تعلیم نے اس قدر صاف اور واضح بنا دیا ہے اور اس طرح اس کی تدوین کر دی ہے کہ افراد و جماعت کو مختلف حالات میں اس پر عمل پیرا ہونے کی ضرورت اور طریق کے بارے میں کوئی ابہام باقی نہیں رہ جاتا۔

سود

سود جماعتی مفادات کے لیے پیغامِ ہلاکت اور جذبۂ اخوت و اخلاص کے لیے پیغامِ مرگ ہے۔ کسی بھائی کی مجبوری اور تکلیف پر اپنی ترقی کی بنیادیں استوار کرنا اعلیٰ اخلاق و اوصاف کی دُنیا میں حد درجہ سفلہ پن شمار ہوتا ہے۔ اسی لیے ارشاد ربانی ہے۔

يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ ۗ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ ۝

(البقرہ ۲:۲۷۶)

اللہ سود کو مٹاتا ہے اور صدقات کو بار آور بناتا ہے۔ اور اللہ کسی ناشکرے گناہ گار کو پسند نہیں کرتا۔

دولت کا سمٹتے چلے جانا' اسے انتہائی کنجوسی سے جمع کرتے ہی چلے جانا اور خزانے کے سانپ کی طرح اس پر بیٹھ جانا بنی نوعِ انسانی پر ایک بڑے ظلم سے کم نہیں۔ اس لیے مسلمان کو اللہ تعالیٰ کی عطا کی ہوئی دولت کو خرچ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ تاکہ اپنی ضروریات پوری کرنے کے بعد اس کے پاس جو زائد دولت بچ رہے اسے خرچ کر ڈالے۔ میں نے سود یا ربوا کے متعلق جس آیت مبارکہ کا حوالہ دیا ہے اس میں ایک حقیقت پوشیدہ ہے۔ جو اکثر لوگوں کی نظروں سے آج بھی پوشیدہ ہے۔ اور وہ حقیقت یہ ہے کہ حصولِ دولت کے لیے کوشش انسانی مسرت و تہذیب میں اضافہ کرتی ہے۔ اور مسرت و تہذیب کا حصول صرف دولت کی مناسب گردش یعنی افراد کے حرص و بخل کو کم کرنے اور ان کے جذبۂ سخاوت کو بروئے کار لانے سے ممکن ہوسکتا ہے۔ دوسروں کا کیا تذکرہ' خود مسلمانوں میں سے بہت سے لوگ بھی سود کی حرمت کو ایک فرسودہ قانون کہتے ہیں۔ ایسے لوگوں نے موجودہ زمانے کی چکاچوند اور شان و شوکت کو گہری اور حقائق شناس نظروں سے نہیں دیکھا۔ موجودہ زمانے کی کاروباری زندگی کے بہت سے طریقے

جو اسلام جائز قرار نہیں دیتا' سود کے مقابلے میں' جس کی مذمت ہر ذی شعور اور فہیم انسان کرتا ہے' بے ضرر معلوم ہوتے ہیں۔ سود کے بدل کے طور پر تو موجودہ مالیاتی نظام بے حد غنیمت دکھائی دیتا ہے۔ لیکن اس کا معاشرتی اثر ہمیشہ جذبۂ اخلاص وانسانیت کے خلاف رہا ہے۔

آج سوشلزم' کمیونزم اور سینڈیکلزم معاشرہ کے سرمایہ دارانہ نظام کی تباہی پر جسے بہ مشکل ایک سو سالہ زندگی نصیب ہوئی ہے' کیوں آمادہ ہیں اس کی کیا وجہ ہے کہ جب روس میں بالشویکیوں کو اقتدار حاصل ہوا تو انھوں نے جو کام سب سے پہلے کیا وہ سود کو حرام قرار دینا تھا۔ سود کی مخالفت ہر قسم کی اشتراکیت کے نظام میں کیوں شامل ہے؟ اس لیے کہ سود سرمایہ دارانہ نظامِ زندگی کی بنیاد ہے۔ اور سود کو حرام قرار دینے والوں کی رائے میں سود ہی تمام معاشرتی برائیوں' بگاڑ' مظالم اور بے انصافیوں کے جڑ ہے۔ اسلامی شریعت نے سود کو حرام اور تجارت کو حلال قرار دیا ہے۔ یہ بات ہمیشہ یاد رکھنی چاہیے کہ قرآن پاک نے جس قسم کی تجارت کو حلال اور جائز قرار دیا ہے۔ وہ آج کل کی بے پناہ منافع اندوزی کی تجارت نہیں جس کا غالب حصہ میری نظر میں ربوا سے مختلف نہیں۔ کیونکہ اس تجارت کو بھی عوام کی بدحالی اور بے بسی سے ترقی وفروغ حاصل ہوتا ہے۔

دولت کا حصول اور مصرف

مے خواری ایک معاشرتی گناہ ہے اور جوا ایک کارِ بد ہے۔ منشیات کا استعمال حرام ہے۔ اس طرح وہ کھیلیں جن میں کامیابی کا انحصار محض اتفاق پر ہو' ممنوع ہیں۔ اسلام نے شخصی ملکیت کی اجازت ضرور دے رکھی ہے اور اسے خوب استحکام بخشا ہے۔ لیکن اس نظریہ کو کہ جائیداد محض فرد ہی کی ملکیت ہے اور وہ اسے جیسا چاہے صرف کر سکتا ہے اور وصیت کے ذریعے جسے چاہے دے سکتا ہے' ایک معاشرتی گناہ قرار دیتے ہوئے باطل قرار دے دیا گیا ہے۔ مال ودولت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک امانت ہے۔ اور شریعت کی صاف اور واضح شرائط کے تحت انسان اس کا حامل ہے۔ مسلمان کی آمدنی کا

ایک خاص حصہ غریبوں اور محتاجوں کے لیے ہے۔ اور اس کے ایک خاص سالانہ حصے پر حکومتِ اسلامی کا حق ہے۔ جب کوئی صاحبِ جائیداد مسلمان انتقال کر جائے تو اس کی جائیداد خاص نسبت سے اس کے رشتہ داروں میں تقسیم ہونی چاہیے۔ مسلمانوں کے مال و دولت میں مردوں اور عورتوں کے مخصوص حصے معین کر دیئے گئے ہیں۔

اسلامی اخوت اور انسانی برادری

جارحانہ قومیت کا تصور نوعِ انسان کے لیے ہلاکت خیز ہے۔ اس لیے اسلام نے اس جذبہ کو نابود کر دیا ہے۔ اسلامی اخوت نے رنگ و نسل کے امتیازات مٹا دیئے اور آئینِ اخوت نے جماعتوں کے اختلافات کو دور کر کے انسانوں کے درمیان ذلت' نفرت و تکبر کے جذبات کی بیخ کنی کر دی ہے۔ پیشوں کا اختلاف البتہ اپنی جگہ قائم رہتا ہے۔

اسلامی تہذیب ایک مکمل نظام ہے جو انسانی فکر و عمل کے ہر میدان پر حاوی اور مادیات اور روحانیات پر برابر محیط ہے۔ یہ نظام تاریخِ عالم میں زیرِ عمل رہ کر فقید المثال کامیابی حاصل کر چکا ہے۔

میں نے اپنے گزشتہ خطبہ میں اسلامی تہذیب کے زوال کی تاریخ دہراتے ہوئے شریعت کے بعض احکامات کی خلاف ورزی کو اس کا سبب قرار دیا تھا۔ اسلامی نظام آج کہیں بھی زیرِ عمل نہیں۔ لیکن اس زمانے میں بھی کم از کم اخوت کے لحاظ سے تو مسلمان دوسری اقوامِ عالم سے آج بھی اتنے ہی آگے ہیں جتنے کہ وہ حضرت عمرؓ، عمر بن عبدالعزیز، ہارون الرشید' صلاح الدین ایوبی یا سلیمان پرشکوہ کے زمانے میں تھے۔ اسلام نے تاریخِ عالم میں ہر قسم اور ہر حیثیت کے انسانوں کی جن کا تعلق مختلف جماعتوں اور اقوام سے تھا اور ہے' ایسی ہی ایک ملّت واحدہ پیدا کر دکھائی ہے جس کے رشتۂ اخوت و محبت و یگانگت و وحدت کو غنیم کے حملے' سیاست کی شاطرانہ چالیں اور مخالف افواج کی یورشیں بھی گزند نہیں پہنچا سکیں۔ جمعیتِ اقوام مختلف اقوام کے باہمی اتفاق و اتحاد کی خاطر ایک بین الاقوامی امن و ترقی کا نظام قائم کرنے کی خاطر معرضِ وجود میں آئی۔ لیکن یہ تو اس مقصدِ اعلیٰ کا ایک نہایت ادنیٰ سا نمونہ ہے جو اسلام نے عالمِ انسانیت

کے سامنے عالم اسلام کے عمل سے پیش کر دیا۔ جمعیت اقوام کو طرح طرح کی مشکلات کا سامنا ہے۔ جمعیت یا انجمن ظالمانہ یا جارحانہ قومیت اور سامراج کے اصولوں کو تسلیم کرتی ہے انجمن یا جمعیت (لیگ) کی تشکیل میں ان لوگوں نے حصہ لیا ہے جو ایسے انسانیت دشمن اصولوں کے حامی اور پرستار ہیں اس لیے یہ امید کہ لیگ یا انجمن ان اصولوں کو مانتے ہوئے موجودہ مشکلات کے باوجود انسانی دکھوں اور مصائب کا کوئی حل یا مداوا پیش کر سکے گی' ایک خوش فہمی سے زیادہ نہیں۔ انسانی مسائل کا حل تو اس اصول کا علمی اعتراف ہی ہے کہ اقوام کو افراد جیسے حقوق حاصل ہیں اور ان کے لیے وہی اخلاقی معیارات اور قوانین ہیں جو افراد پر لاگو ہوتے ہیں۔ جمعیت اقوام یا لیگ آف نیشنز کا مطمعٔ نظر اور مقصد اسلامی اخوت کے نظام جیسا ہونا چاہیے۔ کیونکہ ملّتِ اسلامیہ میں دلوں کا اتحاد موجود ہے۔ کسے نہیں معلوم کہ دُنیائے اسلام کی سیاسی کمزوری اور انتشار کے باوجود مسلمانانِ عالم کے دل ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں۔ اخوتِ اسلامی کے اس نظارے سے مضطرب ہوکر ہی بعض لوگ یوں کہنے لگتے ہیں کہ مسلمان قومیت پرستی کے دعوے کے باوجود وطن پرستی کے جذبہ سے عاری ہیں ان میں تو مذہبی جوشِ جنون کی حد تک بھرا ہوا ہے۔ یہ بدنصیب لوگ تو یہ چاہتے ہیں کہ مسلمان اپنے بلندترین اور اعلیٰ ترین اصولوں کو بین الاقوامی اصولوں کے پس پشت ڈال کر کٹر قومیت پرستی کو اختیار کرلیں۔ اگر خدانخواستہ مسلمانوں نے ایسی غلطی کی تو وہ وہی کریں گے جو بنی اسرائیل نے کیا یعنی قرآنِ حکیم کے الفاظ ہیں۔ ''وہ بہترین چیز کیعوض بدترین چیز لیں گے''۔

اسلام نے ان مسائل کے حل میں یورپ کو اپنے ظہور سے لے کر آج تک اپنی گرد تک نہیں پہنچنے دیا۔

اسلامی اخوت کا قیام اور اس کی ہمہ جہتی چند اصولوں پر مبنی ہے۔ یہ ایک ایسا عدیم المثال جذبہ ہے جس نے گورے کالے سرخ و سیاہ کو مکمل اتحاد و مساوات کی لڑی میں پرو دیا ہے۔ اسی جذبہ نے چھوٹے بڑے امیر غریب و مالدار آزاد غلام آقا و محکوم سب کو ایک ہی صف میں کھڑا کر دیا ہے اور باہم مربوط کر دیا ہے۔

نماز اور حج

اسلامی بھائی چارے کا ایک عملی مظاہرہ تو نماز باجماعت میں دکھائی دیتا ہے جس میں روزانہ اور ہفتہ میں ایک مرتبہ (بروز جمعہ) زیادہ بڑے پیمانے پر مسلمان جمع ہوتے ہیں' جہاں پر چھوٹے بڑے' امیر غریب' آقا ومحکوم کا بلا امتیاز ایک ہی صف میں ایک دوسرے کے شانہ بشانہ کھڑے ہونے کا نظارہ دُنیا کو تحیر زدہ کر دیتا ہے۔ نماز میں امامت دولت اور جاہ وحشمت کو نہیں نصیب ہوتی بلکہ علم' تقویٰ اور پرہیز گاری کے حصے میں آتی ہے۔ حج اسلام کا ایک اہم رکن ہے۔ جس پر اس عیش کوشی کے زمانے کو استہزا کی سوجھتی ہے۔ حج میں امیر غریب' آقا وغلام' بادشاہ فقیر سب ایک موٹے لباس میں ملبوس ہوتے ہیں اور ایک ہی طریق پر ایک ہی طرح کے شعائر ادا کرتے ہیں۔ ان میں ایسی مکمل مساوات پائی جاتی ہے۔ جو موت بادشاہ اور فقیر کے درمیان قائم کر دیتی ہے۔ حج ہر صاحبِ استطاعت مسلمان پر فرض ہے۔ حج کی تیاری میں مسلمان وصیت کرتا ہے۔ گھر بار چھوڑتا ہے اپنے کاموں کو چھوڑتا ہے اور بے حد طویل اور حوصلہ آزما سفر پر روانہ ہو جاتا ہے۔ اس میں اسے کسی دُنیاوی منفعت کا لالچ نہیں ہوتا۔ وائے افسوس! دُنیا میں کتنے ہی بدنصیب لوگ ایسے ہیں جو اس سفر کو جو مسلمان کے لیے ہزاروں برکتوں اور سعادتوں کو اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے' ایک کارِ زیاں سمجھتے ہیں!

روزہ

رمضان کے روزے مہینہ بھر کا سالانہ تربیتی اہتمام ہے۔ جس میں ہر صحت مند مسلمان صبح تا شام مکمل روزہ رکھتا ہے۔ روزہ امیر غریب بادشاہ وگدا آقا وغلام سب پر فرض ہے۔ آج کی دُنیا میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو العیاذ باللہ روزہ کو فضول کہتے ہیں اور سمجھتے ہیں۔ لیکن کوئی شخص جو انسانی زندگی کے اتار چڑھاؤ پر نگاہِ غائر بھی رکھتا ہے اور جانتا ہے کہ مصائب کا انتہائی حوصلہ و استقلال سے مقابلہ کرنے کے لیے کس قسم کی تربیت کی ضرورت ہے' ایک لحہ کے لیے بھی روزہ کے فوائد اور برکات سے انکار نہیں

کرسکتا۔ ہر شخص کو زندگی کی جدوجہد میں وقت آن پڑنے پر سپاہیانہ طریقہ اختیار کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ خاص طور پر ان لوگوں کو جو بنی نوع انسان کی ترقی کے اصولوں کی پاسداری چاہتے ہیں۔ اصل میں یہ ہنگامی قانون آنحضرت صلیہ اللہ علیہ وسلم کے اس ارشادِ پاک ''موتوا قبل ان تموتوا'' یعنی موت سے پہلے مرجاؤ'' کی ایک عملی تفسیر ہے' انسانی ارادہ اور رائے کے ایثار کا نام ہے۔ نماز کو لیجیے۔ جائے نماز قبر سے مشابہ ہے۔ رکوع اللہ تعالیٰ کی عظمت و کبریائی کے سامنے سرِتسلیم خم کرنا ہے۔ سجدہ اشارے کے معنی میں ایک موت ہے جس کا مطلب ہے روزِ قیامت اللہ تعالیٰ کے حضور اپنے آپ کو پیش کرنا۔

رمضان المبارک میں مسلمان کی زندگی میں ایک انقلاب برپا ہو جاتا ہے۔ سحر تا شام کی اذان تک امیر غریب سب بھوک و پیاس کی سختیاں جھیلتے ہیں۔ پھر جب اذان ہوتی ہے تو مسلمان بادشاہ بھی پانی کا گلاس الحمد اللہ کہہ کر نعمت کے شکر کے اقرار کے ساتھ پیتا ہے۔ حج پر مسلمان گویا ایک طرح سے اپنے آخری سفر کی تیاری کرتا ہے۔ وہ اپنا کاروبار چھوڑ دیتا ہے' قرض ادا کر دیتا ہے۔ اپنی وصیت تیار کرتا ہے اور دُنیا کے بکھیڑوں سے نجات پا کر گھر سے نکل کھڑا ہوتا ہے۔ زندگی اپنے تمام ہنگاموں اور دل کشیوں کے ساتھ نوع انسان میں مخاصمت ورقابت پیدا کرتی ہے۔ موت امیر غریب' ادنیٰ اعلیٰ' شاہ وگدا کا امتیاز مٹا کر سب کو ایک کر دیتی ہے۔ موت دراصل ایک اعلان ہے کہ اللہ کے حضور ہم سب برابر ہیں۔ ہمارا غرور ہماری جاہ وحشمت اور شان وشوکت غرض وہ تمام چیزیں جو زندگی میں انسانوں کے لیے وجۂ امتیاز وتفریق بنی ہوتی ہیں قبر کی سرحد پر ختم ہو جاتی ہیں۔ موت بلاشبہ زندگی کی سب سے بڑی حقیقت ہے اور وہ نظام جو اس واقعہ کی اہمیت کو نظر انداز کر دیتا ہے' یقیناً گمراہ کن ہے۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ موت کے انتظار اور خوف میں ہاتھ پیر توڑ کر بیٹھ جانا اس دُنیا کے حقوق سے صرف نظر کرنا ہے جس کی بادشاہت دوسری بادشاہتوں کی طرح صرف اللہ تعالیٰ ہی کو سزاوار ہے۔ اسلام ہمارے سامنے وہ نظام پیش کرتا ہے جس پر عمل انسان کو موت کے خوف

سے نجات دلا دیتا ہے اور موت کو ہمارے سامنے اپنے اصلی رنگ میں کھڑا کر دیتا ہے۔

اسلام کی راہ امید و مسرت کی راہ ہے غم و مایوسی سے اسے کوئی واسطہ نہیں۔ یہ حقائق عام لوگوں کے لیے سادہ اور مضبوط ہیں اور نگاہِ بینا رکھنے والوں کے لیے انتہائی حکمت آموز اور تمام انسانوں کے لیے انسانی اخوت کی مضبوط ترین بنیاد۔

زکوٰۃ اور اسلام کا معاشی نظام

میں نے ابھی عرض کیا تھا کہ مسلمان اخوت کے معاملے میں دوسرے مذاہب سے آج بھی اتنا ہی آگے ہیں جتنا کہ اس زمانے میں تھے جب آفتابِ اسلام اپنی شان و شوکت کی انتہائی بلندیوں پر ضوفگن تھا۔ اس سے میرا مطلب یہ نہیں کہ اس لحاظ سے مسلمانوں میں کوئی تنزل رونما نہیں ہوا۔ بلکہ میری مراد یہ ہے کہ آج بھی اخوت کی جو صورت مسلمانوں میں پائی جاتی ہے اس کی ایک معمولی سی جھلک تک دوسرے مذاہب کے ماننے والوں میں نہیں دکھائی دیتی۔

مسلمانوں کا تنزل جس جگہ بھی اور جس لحاظ سے بھی دکھائی دے گا اس کی وجہ وہی شریعت کی خلاف ورزی ہوگا۔ اخوت سے متعلق مسلمانوں کے انحطاط کی وجہ زکوٰۃ سے روگردانی اور اس کے نظام کی تباہی ہے۔

زکوٰۃ کا مطلب ہے ''کاشت کے ذریعے بڑھانا''۔ جس زمانے میں زکوٰۃ باقاعدہ ادا کی جاتی تھی اور جو کچھ بچ جاتا تھا اسے بیت المال میں جمع کر دیا جاتا تھا۔ (بیت المال ایک طرح کا بینک تھا جو تمام قوم کی ضروریات پوری کرنے کا ذمہ دار تھا) تاریخ گواہ ہے کہ مسلمانوں میں اس زمانے میں غریبوں اور مفلسوں کی کمی ہوتی تھی۔ جن مسلمان ملکوں میں آج باقاعدگی سے زکوٰۃ وصول کی جاتی ہے اور تقسیم کی جاتی ہے (مثلاً نجد میں) وہاں مسلمانوں میں آج بھی ناداروں کا وجود نہیں۔ جن اسلامی ممالک میں نظامِ زکوٰۃ رائج نہیں وہاں غریبوں مفلسوں کی کثرت ہے۔ اس غفلت اور اس کے نتیجہ یعنی مسلمانوں کی مفلوک الحالی کے لیے عوام پر الزام رکھنا درست نہیں۔ یہ گذشتہ زمانے کی ان مطلق العنان حکومتوں کا قصور ہے۔ جنھوں نے اپنے تمام امور کو عوام کے

ہاتھوں سے نکال لیا اور انھیں حکومت میں جائز حصہ سے محروم کر دیا۔ اس طرح انھوں نے ایسے امور کی انجام دہی میں سرکاری عمال پر بھروسہ کرنے کی عادت ڈال دی جن کی ادائیگی خود ان کی اپنی ذمہ داری تھی۔

مسلمانوں کی ہر جماعت کا جو مسلمانوں کی ترقی اور خوشحالی کی خواہاں ہے، پہلا فرض ہے کہ وہ تحفظات کے ساتھ زکوٰۃ کے نظام کو از سر نو رائج کرنے کی کوشش کرے۔ بلکہ ایسے افراد کے لیے ضروری ہے کہ وہ اسلام کے نظامِ مالیات کا گہری نظر سے مطالعہ کریں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ خیال عام ہے کہ اسلام کا سرے سے کوئی معاشی نظام ہی نہیں نہ مسلمانوں میں کوئی کاروباری صلاحیت موجود ہے۔ موجودہ زمانے میں انگریزی تعلیم و تربیت کی بدولت ایک مسلمان ماہر مالیات سر اکبر چوہدری کا نام مشہور ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسلام کا اپنا ایک مکمل نظام مالیات موجود ہے اور مسلمانوں میں بھی بڑے ماہرین معاشیات گزرے ہیں۔ مشکل صرف یہ ہے کہ موجودہ زمانہ کے کاروباری لوگوں کے لیے مسلمان تاجروں اور ماہرین کے طرائق کو سمجھنے کی کوشش بھی ایک مشکل کام ہے۔ کیونکہ ان کے اعمال کا محور اپنی ذات اور ریاست کے لیے ضروری منافع اندوزی کے بجائے عوامی فلاح و بہبود یعنی عوام کی خوش حالی اور معاشی بہتری تھا۔ اسلامی تہذیب کی برتری اور سر بلندی میں اس نظریۂ عمل کو بڑا دخل حاصل تھا اور اسی جذبہ اور عمل کا تدریجاً ختم ہو جانا ہی اسلامی تہذیب کی تنزلی کا سبب بنا ہے۔ اسلامی معاشی نظام پر بعض مستشرقین نے کچھ کتابیں بھی لکھی ہیں۔ جن میں ایک امریکی پروفیسر کی کتاب خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ اس امریکی پروفیسر کے خیال میں اسلامی نظام جو شرعی قوانین کے تحت وجود میں آیا اور ایک عظیم الشان سلطنت میں زیر عمل رہا ان مسلمانوں کے لیے خاص دلچسپی کا حامل ہو گا جن کے دل و دماغ میں موجودہ نظامِ مالیات وتجارت نے ایک اضطراب وخلش سی پیدا کر دی ہے۔

کسی مضبوط جماعت کی تعمیر یا مائل بہ تنزل جماعت میں حیاتِ نو پیدا کر دینے کا یہی ایک آسان ترین، موثر ترین اور تیر بہدف نسخہ ہے۔ لیکن یہ طریق ہر شخص سے قربانی

چاہتا ہے۔ جب ہم اپنے افعال و کردار کو شریعت کے تابع کر لیں تو ہمیں اس تمام مال و دولت اور ان عطیات کو جو اللہ تعالیٰ نے ہمیں عطا فرمائے ہیں اپنی مرضی سے نہیں بلکہ رضائے الٰہی کے مطابق خرچ کرنا ہوگا۔

موجودہ زمانے کے خداؤں کا فرمان ہے۔ ''جس قدر ممکن ہو بچت کرو۔ جمع جتھ کے لیے کوئی کام اختیار کرو۔ اسے سود پر دے ڈالو ورنہ بینک ہی میں جمع کرا دو''۔ لیکن قرآن پاک کا ارشاد ہے۔ ''جو کچھ بچ رہے وہ خرچ کرو''۔ یعنی اپنی اور اپنے اقربا کے ضرویات پوری کرنے کے بعد زکوٰۃ کے بعد اور معقول اور مقررہ صدقات و خیرات ادا کرنے کے بعد جو کچھ بچ رہے اسے اس طرح خرچ کرو کہ تمھارے دوسرے بھائیوں کو اس سے فائدہ پہنچے اور مستحق لوگوں کی حوصلہ افزائی ہو اور بنی نوع انسان کی برادری کا احساس وشعور اس سے پرورش پائے۔ اسلام نے سود یا ربوا کو قطعاً حرام قرار دیا ہے۔ یہ ایک غریب بھائی کا خون چوسنا ہے۔ اسلام نے ایسی ہی سختی کے ساتھ اسراف کی بھی ممانعت فرمائی ہے۔ اسراف کے معنی اللہ کی دی ہوئی دولت ونعمت کا ایسا ضیاع ہے کہ اس سے کسی کو حقیقی فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔ بلاشبہ دُنیا کو آج شریعتِ اسلامی کے بعض احکام تحیر کن نظر آتے ہیں اور دُنیا بظاہر ان احکام کی مصلحت سمجھ لینے سے قاصر ہے۔ ان احکام کی مصلحت سمجھ لینے سے اس اصول کا سمجھ لینا بھی ضروری ہے کہ یہ احکام ایک ایسی جماعت کے لیے وضع کیے گئے ہیں جس میں کسی کو فاقوں سے نہیں مرنے دیا جاتا۔ اور جس جماعت نے، جب تک وہ قائم رہی، زیادہ سے زیادہ لوگوں کے لیے زیادہ سے زیادہ سہولتوں اور آسائشوں کی فراہمی کی ایک ایسی مثال قائم کر دی جس کی نظیر تاریخ پیش کرنے سے قاصر ہے۔ میری رائے میں آج کل کے مسلمانوں کے لیے اسلام کے معاشی نظام کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔

تعلیم

مسلمانوں کی تنزلی کا ایک دوسرا بڑا سبب مسلمان مرد و زن کے لیے حصولِ تعلیم کے حکم سے روگردانی ہے۔ ہندستان میں تو اس حکم کی نافرمانی افسوس ناک حد تک پہنچ

چکی ہے۔ دوسرے اسلامی ملکوں مثلاً مصر اور مملکتِ ترکی میں موجودہ دورِ تعلیم کے آغاز سے پہلے بھی عالمگیر تعلیم کا ایک نظام موجود تھا۔ ایک زمانے میں یہ نظام ایک نمایاں حیثیت کا حامل تھا۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس نظام پر غفلت، جمود اور بے حسی طاری ہو چکی تھی۔ لیکن اس کی بدولت اتنا ضرور تھا کہ ہر مسلمان اسلامی تعلیمات اور مذہبی فرائض سے تھوڑی بہت واقفیت ضرور حاصل کر لیتا تھا۔ ہندستان تو آج ایسے نظام سے بھی محروم ہے۔ ہندستان میں ایسے کتنے ہی مسلمان موجود ہیں جو مذہب سے بالکل ناواقف ہیں۔ اور شاید وہ کلمہ طیبہ بھی نہیں جانتے۔

طرفہ تماشا یہ ہوا کہ مسلمانوں نے تقریباً تمام مسلم ممالک میں مغربی تعلیم کی اشاعت و ترقی کی مخالفت کی جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ عالمِ اسلام میدانِ عمل میں دوسرے ممالک سے پیچھے رہ گیا۔ اس نے دوسروں کو اپنے اوپر غلبہ پاتے ہوئے دیکھا۔ اور اس کی وجہ سے لاعلمی کی وجہ سے وہ رنج و کرب اور مایوسی و ناامیدی میں مبتلا ہو گیا۔ اس میں ہر جگہ غربت و افلاس نے ڈیرے ڈال دیئے۔ اس افسوس ناک صورتِ حال کا کافی عرصہ میں ہی مداوا ہو سکتا ہے۔ یہ اللہ کا شکر ہے کہ بہت سے لوگ جو صاحبِ فہم و شعور ہیں اس کی فکر کر رہے ہیں لیکن جب تک موجودہ حالت برقرار ہے دیدۂ بینا رکھنے والوں کے لیے اخوتِ اسلامی کی اس عظیم الشان مشعل کی روشنی جس نے تاریخ کے اوراق کو روشن کر دیا ہے، بجھی بجھی سی رہے گی۔

مسلمان بادشاہوں کی باہمی رنجشیں، رقابتیں، محاذ آرائیاں، سیاسی اختلافاتِ رائے اور رنگ و نسل کا امتیاز اسلامی اخوت پر نہ کبھی اثر انداز ہوئے ہیں نہ ہی ہوں گے۔ غیر مسلموں کے لیے مسلمانوں کا یہ کارنامہ ایک معمہ ہے۔ کسی اجنبی شخص کا اپنے آپ کو مسلمان بتانا اور السلام علیکم پکارنا مخاطب مسلمان کے دل میں مسرت اور اپنائیت کے جن جذبات کی ایک کیف آور لہر دوڑا دیتا ہے اس کے سرور انگیز لطف کے احساس سے ایک غیر مسلم کا دل ہمیشہ محروم رہے گا۔

مسلمانوں کے اختلاف شدید اصولی اختلاف نہیں، یہ مقاصد سے نہیں ذرائع

سے اور منزل سے نہیں راستے سے متعلق ہے۔ ہر مسلمان کی منزلِ مقصود اسلام ہے اور منزلِ اسلام عقیدۂ توحید کی بنیاد پر بنی نوعِ انسان کے اخوت کا ظہور ہے۔ ہمارا اختلاف تو صرف حصولِ مقصد کے طریقوں کے سلسلے میں ہے۔ ان شا اللہ تعالیٰ اسلامی تعلیم کی ترویج و ترقی یعنی علم القرآن اور اسلامی تعلیمات کا زمانۂ حال کی ضروریات سے مقابلہ اور تطابق ہمارے اختلافات کو دور کر دے گا اور اسلامی اخوت کی حدود سے متعلق، جس کی آغوشِ شفقت میں مسلم، غیر مسلم سب جو اس زمین پر اللہ کی حکمرانی کے قیام کے خواہاں ہیں، شامل ہیں، تمام غلط فہمیاں دور ہو جائیں گی۔

○○○

خطبۂ چهارم

سائنس، فنون اور ادب

آج میں آپ لوگوں کو سائنس فنون اور ادب کے میدانوں میں مسلمانوں کے کمالات کی ایک مختصر داستان سنانا چاہتا ہوں۔ اس مختصر جائزہ میں میں اسلام کے شاہکار بلکہ اعجاز قرآن پاک سے حجت نہیں کروں گا کیونکہ قرآن پاک اسلام کی تمام تہذیبی ترقی ہی کا نہیں بلکہ تمام عالم اسلام کے تمام کمالات کا سرچشمہ ہے۔

سائنس کو لیجیے۔ ایک طرف تو قرآن پاک نے انسانی فہم و شعور سے اپیل کی اور فطرت کو معجزات سے ارفع مرتبہ عطا کیا دوسری طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حصول علم کی اہمیت کو اپنے ارشادات عالیہ سے مسلم بنا دیا:

- ”علم کی تلاش ہر مسلمان مرد اور عورت کا مذہبی فریضہ ہے“۔
- ”علم حاصل کرو خواہ چین جانا پڑے“۔
- ”اللہ کی مخلوق کے مطالعہ اور غور و فکر کا ایک لمحہ سال بھر کی عبادت سے افضل ہے“۔

اس طرح احکامِ الٰہی اور احادیثِ نبویؐ نے اسلامی تہذیب کی بنیاد اللہ کے نام، آزادئ فکر اور آزادئ تحقیق و جستجو پر رکھی۔

قرآن پاک اور درحقیقت کسی دوسرے الہامی صحیفہ میں کسی سائنٹیفک نمونہ کی جستجو ایک بیکار سی امید اور سعئ لاحاصل ہے۔ وحی الٰہی تو انسانی دسترس سے آزاد قوانین سے متعلق ہوتی ہے۔ طبعی قوانین تو انسان تحقیق و تجربہ سے خود دریافت کر سکتا ہے اور

درحقیقت انسانی ترقی اور تمدن حصولِ علم کی ایسی ہی کوشش کا نام ہے۔ جب عقل کُل، عقلِ محدود سے مخاطب ہوتی ہے تو انسانی حدود کو ملحوظ رکھنا پڑتا ہے ورنہ اس کا پیغام ہمارے فہم و ادراک سے بالاتر ہوگا اور گناہ گار بندے اس سے دور بھاگنا شروع کر دیں گے۔

قرآن پاک کے بعض مقامات اگر ان کے نفسِ مضمون سے الگ کر کے دیکھے جائیں تو وہ سائنس کے خلاف دکھائی دیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ حقائق ایک مخصوص وقت کی زبان میں بیان کیے گئے ہیں۔ آج کی زبان اس وقت کون سمجھ سکتا تھا۔ اس کے خلاف بعض مقامات ہمیں انسانی علم کی انتہائی رفعتوں کا علم دیتے ہیں۔ اس سلسلے میں میں صرف تین حوالے دوں گا۔

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ وَلَا طٰٓئِرٍ یَّطِیْرُ بِجَنَاحَیْهِ اِلَّآ اُمَمٌ اَمْثَالُکُمْ ط مَا فَرَّطْنَا فِی الْکِتٰبِ مِنْ شَیْءٍ ثُمَّ اِلٰی رَبِّهِمْ یُحْشَرُوْنَ ○

(الانعام ۶: ۳۸-۳۹)

نہیں ہے زمین پر کوئی جانور اور نہ کوئی پرندہ جو اپنے پروں پر اڑتا ہے مگر وہ ایک امت ہے تمھاری جیسی۔ ہم نے اس کتاب میں کوئی چیز نہیں چھوڑی ہے۔ اور پھر وہ اپنے رب ہی کی طرف دوبارہ جمع کیے جائیں گے۔

سُبْحٰنَ الَّذِیْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ کُلَّهَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ وَمِنْ اَنْفُسِهِمْ وَمِمَّا لَا یَعْلَمُوْنَ ○ (سورۃ یٰسین ۳۶: ۳۶)

پاک ہے وہ ذات جس نے سب جوڑ پیدا کیے۔ از قسم ان چیزوں کے جو زمین اگاتی ہے اور از قسم خود ان کی ذات کے اور از قسم ان چیزوں کے جن کا ان کو علم نہیں ہے۔

سائنس کے نو بہ نو انکشافات میں ایک یہ ہے کہ ہر چیز کا جوڑا موجود ہے۔ یہاں تک کہ پہاڑوں اور بجلی میں بھی یہ بات موجود ہے۔ اور میرے لیے باوجود میری سمجھ و شعور سے بالاتر ہونے کے اہم ترین الفاظ یہ ہیں: "اور تمھیں ایک ہی روح کے طور پر

جانچا جائے گا"۔

بنی نوع انسان کی روح شاید تمام مخلوقات کی روح! قرآن پاک نے بلا شبہ علم اور خاص طور پر طبیعیات کے لیے ایک شوق اور جستجو پیدا کر دی۔ اور جیسا کہ موجودہ زمانے کے بعض مصنفین نے تسلیم کیا ہے کہ طریقۂ استخراجیہ جو درحقیقت موجودہ زمانے کے اہم اکتشافات کی بنیاد ہے' قرآن پاک ہی کا بتایا ہوا ہے۔ اس لیے قرآن پاک کو موجودہ زمانے کی سائنسی ترقی کا سرچشمہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

مسلمان اللہ کا نام لیتے ہوئے اس وقت علم کی تلاش میں نکلے جب عیسائی قدیم دُنیا کے علوم کو حضرت عیسیٰؑ کے نام پر تباہ کر رہے تھے۔ انھوں نے اسکندریہ کا کتب خانہ تباہ کر دیا تھا اور بے شمار فلسفیوں کی جن میں حسین پاشا بھی شامل ہے' فنا کے گھاٹ اتار دیا۔ عیسائیوں کی نظر میں علم تو شیطان کا ایک جال تھا جس میں کافر ہی پھنس سکتے تھے۔ ان کے پاس "علم حاصل کرو چاہے چین جانا پڑے" جیسی کوئی ہدایت موجود نہ تھی۔ پادریوں نے یونانی اور رومی علوم کے مخطوطات کھلے عام نذرِ آتش کر دیے۔ مغربی رومی تو وحشت اور درندگی پر اتر آئے تھے۔ مشرقی رومی بادشاہوں نے بلاشبہ اپنے کتب خانے بھی قائم کیے۔ اور بعض علماء کی قدردانی بھی کی۔ لیکن یہ سب کچھ شاہی محلات کے اندر تک ہی محدود تھا اور محلات کے باہر وسیع دُنیا پادریوں کے زیرِ حکمرانی تھی۔ اسلامی تاریخ ہمارے سامنے علم دوستی کی ایک نئی ہی تصویر پیش کرتی ہے۔ خلیفہ مامون عباسی نے قسطنطنیہ کے عیسائی بادشاہ پر بعض ماہر علماء کی خدمات حاصل کرنے اور بعض کتابوں کے حصول کے لیے حملہ کر دیا۔ یہ علماء اور کتابیں قسطنطنیہ کے محلات کے قفس سے نکل کر بغداد پہنچیں اور مسلمانوں کو فیض یاب کیا۔ ان علماء اور مسلم علماء کی متحدہ مساعی سے ان قدیم کتابوں کا ترجمہ شروع ہوا اور اس زمانہ قدیم کے وہ گنج ہائے گراں مایہ نہ صرف معدوم ہونے سے بچ گئے بلکہ دُنیائے جدید کو وراثت میں بھی مل گئے۔

علمِ کیمیا (کیمسٹری)

علم کیمیا کے میدان میں مسلمان مسلسل تجربات میں مصروف تھے اور سب سے

اہم اور قابل ذکر بات یہ تھی کہ وہ اپنے تجربات و مشاہدات کو باقاعدہ ورطۂ تحریر میں لایا کرتے تھے اور ایک دوسرے سے نتائج کا مقابلہ کرتے تھے۔ مسلمانوں سے پہلے جو بھی سائنسی علوم تھے وہ سائنس دان اپنے سینے میں راز کی طرح پوشیدہ رکھتے تھے۔ مقصد یہ تھا کہ ان رازوں کا امین صاحبِ کمال شخص تسلیم کر لیا جائے اور اس کی خوب شہرت ہو۔ اس کے برخلاف مسلمان سائنس دان اپنے تجربات و نتائج کی اشاعت کرتے تھے اور باہم دیگر مشورہ و مدد کی قدر کرتے تھے۔ وہ طریقۂ استخراجیہ سے جو انھوں نے سب سے پہلے اختیار کیا' ہر مسئلہ کو آہستہ آہستہ سمجھتے جاتے تھے۔ وہ چھوٹی سی تفصیل پر نتیجہ کو قائم نہ کر لیتے تھے اور ہر مرحلے پر اپنے مشاہدات ورطۂ تحریر میں لاتے جاتے تھے۔

موجود علمِ کیمیا یا کیمسٹری اور اس کے تمام تحیّر کن انکشافات کی بنیاد وہی مواد ہے جو مسلمان سائنس دانوں نے اس طرح مجتمع کیا۔ تیسری صدی ہجری کے ایک مسلمان کیمیا دان نے تحریر کیا:

''علم کیمیا میں سنی سنائی باتوں اور بے دلیل دعووں کی کوئی گنجائش نہیں۔ یہ ایک مسلّمہ اصول ہے کہ جس کلیہ کے لیے کوئی ثبوت مہیا نہیں کیا جا سکتا اسے تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ جب کوئی اپنے دعوے کا ثبوت پیش کرتا ہے تو ہم کہتے ہیں کہ تمھارا کلیہ درست ہے''۔

ابتدائی سات آٹھ صدیوں تک مسلمان علماء کا یہ طرزِ عمل تھا اور سب ہی تجربہ و مشاہدہ کے حامی اور ثبوت کے طلب گار تھے۔

طبیعیات (فزکس)

طبیعیات میں بھی مسلمان سائنس دانوں کا رویہ تجربہ اور اس کے نتائج کو ورطۂ تحریر میں لانا تھا۔ ان میں بڑے بڑے ریاضی دان اور انجینئر پیدا ہوئے اور ہم جانتے ہیں کہ وہی الجبراء کے موجد بھی تھے۔ عربی فارسی ترکی زبانوں کی کسی بھی فرہنگ کو اٹھا کر دیکھ لیجئے۔ آپ کو اس بات کا بین ثبوت مل جائے گا کہ وہ علمِ نباتات سے بخوبی واقف تھے۔ آج بلاشبہ یہ علم اس درجہ نظر اندازی اور پسماندگی کی حالت میں ہے کہ اگر آپ کسی

پڑھے لکھے عرب سے کسی جنگلی درخت کا نام پوچھیں تو وہ یا تو یہ جواب دے گا کہ یہ ایک قسم کی گھاس ہے یا پھر جاہلانہ استکراہ کے ساتھ یہ کہے گا کہ یہ ایک چھوٹا سا پودا ہے۔ عوام تو صرف انھیں درختوں کے نام جانتے ہیں جن کا یا تو انھیں کوئی استعمال معلوم ہے یا ان کی خوشبو ان کی شامہ کو مہکا سکتی ہے۔

نیچرل ہسٹری یا فطری تاریخ میں انھوں نے ارسطو کے علم کا فائدہ اٹھایا۔ ارسطو آج ہمارے لیے ایک نابینا راہنما ہے۔ لیکن اس زمانے میں وہی روشنی کا مینار تھا۔ مسلمانوں نے نیچرل ہسٹری میں جو مشاہدات کیے انھیں قلم بند کریں۔ اس طرح، انھوں نے نہ صرف سائنسی معلومات میں اضافہ کیا بلکہ ساتھ ساتھ ارسطو کی غلطیوں کی اصلاح بھی کرتے گئے۔

جغرافیہ

مسلمانوں نے جغرافیہ کی بھی بے حد خدمت کی ہے۔ اہلِ عرب تجارت، سیر و سیاحت اور جہاز رانی میں اپنے زمانہ کے راہبر اور قائد تھے۔ انھوں نے اپنے سفر و سیاحت کے حالات و مشاہدات پوری تفصیل کے ساتھ تحریر کیے۔ جن ملکوں سے اہلِ عرب کے تجارتی و سفارتی تعلقات تھے۔ عربوں نے نہ صرف ان ممالک کے نقشے تیار کیے بلکہ وہاں کی آبادی کی سیاسی، معاشرتی اور تجارتی تفصیلات بھی تحریر کیں اور ان کی نباتات، حیوانات اور درآمد و برآمد سے متعلق معلومات کا نہ صرف نایاب اور فراواں ذخیرہ مہیا کیا بلکہ دوسرے ممالک کے ان حالات کا مطالعہ بھی اپنے مدرسوں کے نصاب میں داخل کر دیا۔

طبّ

مسلمان نظریاتی و عملی طب میں بھی مسلّمہ کمالات کے حامل تھے۔ یونانی طب اور یونانی حکمت جو عربی میں منتقل ہوئی اور عربوں کے تجربات اور عملی مشاہدات سے مزین ہوئی، صدیوں تک مشرق و مغرب میں رائج رہی اور مستند حیثیت کی حامل رہی۔ مسلمان

اطباء ہی نے سب سے پہلے تازہ ہوا کی خوبیاں اور صفائی کے فائدے بیان کیے۔ مسلمانوں ہی نے سب سے پہلے شفا خانے قائم کیے۔ جن میں بالحاظ امراض مریضوں کی تقسیم علیحدہ علیحدہ وارڈوں میں عمل میں آئی۔ شفا خانوں میں مسلمانوں نے تازہ ہوا اور صفائی کو علاج کا درجہ دیا۔ ان شفا خانوں میں مریض کے آرام و آسائش کو سب باتوں پر ترجیح دی جاتی تھی۔

اٹھارہویں صدی میں ترکوں نے یورپ کو زمانۂ قدیم کے اس خیال سے روشناس کرایا کہ تبدیلی آب و ہوا اور معدنی چشموں کا پانی صحت کے لیے مفید ہیں۔ اٹھارہویں صدی ہی میں ترکوں کی بدولت یورپ والوں کو ٹیکے کا علم ہوا۔ یہ خیال بھی ان کارآمد چیزوں میں تھا جو سٹیوارٹ ورا ٹلے ماٹیگو ترکی سے لایا جس کے مکاتیب ترکوں کے مظالم اور وحشت کے متعلق عوام میں پھیلی ہوئی داستانوں کو جھوٹ قرار دینے کے لیے کافی ہیں۔

فلکیات

مسلمانوں کے علمِ فلکیات کا غالب حصہ علمِ نجوم تھا۔ لیکن وہ اپنی رصد گاہوں کو کافی حد تک قابلِ اعتماد آلات سے آراستہ رکھتے تھے اور اپنے مشاہدات کو پوری دیانت داری کے ساتھ ورطۂ تحریر میں لاتے تھے۔ ہسپانیہ اور سمرقند کی رصدگاہیں مسلمانوں کی مشہور ترین اور اعلیٰ ترین رصد گاہیں شمار ہوتی تھیں۔

ماہرین فلکیات' سیاحوں' جغرافیہ دانوں اور ریاضی دانوں سے اپنے مشاہدات کے اندراجات کا مقابلہ کرتے تھے۔ ان کے متفقہ مشاہدات کا نتیجہ تھا کہ ایک طرف ہسپانیہ کی اسلامی دانش گاہوں میں تو زمین کے حرکت کرنے کا قانون تسلیم کیا گیا تھا دوسری طرف برونو کو پادریوں کی کونسل میں کوپرنیکس کے نظریۂ حرکتِ زمین پر یقین رکھنے کے جرم میں آگ میں زندہ جلوا دیا گیا۔ اور اس سے پہلے گیلیلیو کو نہایت سب وشتم کے ساتھ اس پر مجبور کیا گیا کہ وہ اس بات کا تحریری اعلان کرے کہ انجیل مقدس کی رُو سے زمین ساکن ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جب گیلیلیو مجبوری کی حالت میں اس اعلان پر دستخط

کر رہا تھا تو اس نے دبی زبان میں یہ سرگوشی کی تھی۔ ''زمین حرکت تو ضرور کرتی ہے''۔ ہسپانیہ کی اسلامی دانش گاہ کی بدولت ہی کولمبس کے دل میں زمین کے گول ہونے کا خیال پیدا ہوا اگرچہ بعد میں اسے بھی مذہبی زعما کی کونسل کے سامنے اپنے اس خیال کافرانہ سے توبہ کرنی پڑی۔ جب ہم اس فراموش شدہ تاریخی حقیقت کو یاد کرتے ہیں کہ ہسپانوی دانش گاہوں نے خلیفہ عبدالرحمٰن سوم کے عہد میں اور مشرقی اسلامی دانش گاہوں نے المامون عباسی کے عہد میں' میں صرف ان دو حکمرانوں کا حوالہ محض اس لیے دے رہا ہوں کہ ان کے متعلق یہ تذکرہ بڑی صراحت کے ساتھ موجود ہے کہ عیسائی اور یہودی طلباء کے لیے بھی مسلمان طلباء کے ساتھ ساتھ علم و دانش کے حصول کے دروازے پوری فراخ دلی کے ساتھ کھول رکھے تھے بلکہ ان کے قیام و طعام کے اخراجات بھی ان اسلامی دانش گاہوں کے ذمے تھے۔ اور اسی طرح سینکڑوں عیسائی طلباء جنوبی یورپ اور مشرقی ممالک سے پادریوں کے جبر و استبداد سے بھاگ بھاگ کر اسلامی دعوتِ تحصیلِ علم کے دامن میں پناہ لیتے تھے تو ہم آسانی سے سمجھ سکتے ہیں کہ یورپ کی موجودہ ترقی کس حد تک اسلام کی رہنِ منت ہے عیسائی کلیسا کا تو موجودہ زمانے کی ترقی پر اتنا احسان ضرور ہے کہ وہ علماء پر طرح طرح کے ظلم توڑتا اور انھیں نت نئی اذیتیں پہنچاتا تھا بلکہ انھیں زندہ جلا دیا کرتا تھا۔

نقاشی

آیئے اب ہم نقاشی یا آرٹ کی طرف متوجہ ہوں۔ یہ حدیثِ مبارکہ متفق علیہ ہے کہ مصوری اور نقاشی کو قدرتی تمثال تک ہی محدود رکھا گیا ہے کیونکہ جان دار چیزوں کی مصوری کے ساتھ بت پرستی وابستہ تھی۔ مجھے قرآنِ کریم اور احادیث نبوی میں کوئی صریح حکم نظر نہیں آتا۔ اس قدر ضرور مسلّم ہے کہ ایک مرتبہ ایک ایرانی مصور نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کی تصویر بنانے کی اجازت چاہی تاکہ وہ اسے اپنے ساتھ ایران لے جائے۔ آپؐ نے اس کو اجازت نہ دی کہ مبادا کسی وقت اس کی پرستش شروع ہو جائے۔

تصویر کشی اور مرقع نگاری کو اسلامی تہذیب کے زوال پذیر ہونے کے بعد ایران اور اس کے زیر اثر ممالک میں فروغ حاصل ہوا۔ اگرچہ بعض صورتوں میں نقاشی سے متعلق حیرت انگیز نتائج پیدا ہوئے لیکن انھیں اسلامی نہیں کہا جا سکتا۔ موسیقی اور تمثیل (ڈرامہ) کو بھی مسلمانوں نے مشرکانہ عبادات کے ساتھ وابستگی کی وجہ سے قابلِ نفرت سمجھا۔ عوام کے شوق نے موسیقی کو زندہ تو ضرور رکھا لیکن اسے بھی لہو ولعب ہی کا ایک حصہ قرار دیا گیا اور تمثیل کا مرتبہ تو اسے بمشکل ہی دیا گیا ہے۔ دُنیائے اسلام میں سب سے محترم ومعزز موسیقار تو مؤذن تھے۔ انھیں بے حد عزت وتکریم حاصل تھی۔ جب بھی انھیں تقریبات میں بلایا جاتا تو انھیں نہایت معقول معاوضہ پیش کیا جاتا تھا۔ ان کی گائیگی بھی عام گویوں کے مقابلے میں بہتر ہوتی تھی۔

پہلے زمانے میں تو عالمِ اسلام کے طول وعرض میں ایک روحِ موسیقی اور ایک زمزمہ جاری وساری تھا۔ لیکن یہ ان لوگوں کی موسیقی تھی جو بانسری اور ستار پر صرف خوشی حاصل کرنے کے لیے گاتے تھے۔ ان گانا بجانا ایسا بھی بھاری بھرکم اور مشکل نہ تھا جسے آج کل یورپ میں موسیقی کا نام دیا گیا ہے۔

تمثیل (ڈرامہ)

تمثیل یا ڈرامہ کو تو مسلمانوں نے اس لیے توجہ کے قابل نہیں سمجھا کہ ان کے خیال میں بھیس بدلنا اور سوانگ بھرنا ان کی عزت و وقار کے منافی حرکت ہے۔ اور مسلمان عورت کے لیے تو یہ نہایت معیوب کام ہے۔ تمثیل کو اس طرح ایک نہایت گھٹیا حالت میں یونانیوں اور ارمینوں کی آوارہ گرد ٹولیوں کے ہاتھ میں دے دیا گیا۔

تماثیل کی جگہ اسلامی دُنیا میں ایسے کھیل تماشے پسند کیے جاتے تھے جو خاص تقریبات کے موقع پر عوام میں دکھائے جاتے تھے۔ ان کی نوعیت ہمہ گیر تھی اور وہ اس درجہ مکمل ہوتے تھے کہ صرف نہایت ذہین وفہیم لوگ ہی ان کا حظ اٹھا سکتے تھے۔ اس قسم کے کھیل تماشوں کا حوالہ عمر خیام کی ایک رباعی میں بھی موجود ہے۔ جس کا ترجمہ ہے۔

''ہم جادو کے تماشے کی متحرک تصاویر کی مانند ہیں جو تماشہ کرنے والے کے روشن فانوس

کے اندر چکر لگاتی ہیں''۔

لفظ خیّام جس کے معنی خیمہ ساز کے ہیں۔ ہمیں اسلامی تہذیب کے ایک اور ترقی یافتہ فن کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ خیموں کے اندر کشیدہ کاری کی صورت میں فنِ آرائش نے اپنی رنگینی، پاکیزگی اور دل کشی کے اعتبار سے ایک اونچا مقام حاصل کر لیا۔ خیامین یعنی خیمہ ساز، اور سینٹ پال ایک یہودی عالم انھی میں سے تھا۔ تاجر اور سوداگر ہی نہ تھے بلکہ اپنے تخیل اور ہنرمندی کے اعتبار سے اساتذۂ فن شمار ہوتے تھے۔

میں نے خود ایسے بہت سے تماشے دیکھے ہیں۔ گذشتہ صدی کے آخری عشرہ میں وہ ایشیائے کوچک، شام اور مصر میں رائج تھے۔ اگرچہ عوام کی ان تک رسائی ہو چکی تھی لیکن میں اس امر کی گواہی دے سکتا ہوں کہ وہ بڑا ہی کمال دکھاتے تھے۔ تماشہ کرنے والے بڑے ہی ذہین وفہیم اور زندہ دل ہوتے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ میں نے جو تماشے دیکھے وہ بے حد دلچسپ اور پرلطف ہوتے تھے۔ اسلامی تہذیب میں تمثیل کا ظہور انیسویں صدی کے آغاز سے ہوا۔ اس زمانے میں مسلمانوں نے ترکی اور ایران میں بعض بہت اچھی تمثیل لکھیں۔ لیکن ان کے اداکار تمام تر یہودی اور ارمنی ہوتے تھے۔ بعض نہایت ہی ہنگامہ خیز ڈرامے جو ادب کا درجہ رکھتے ہیں دمشق کے ایک عالم شیخ نے تحریر کیے تھے۔ جو اسلامی تاریخ اور زندگی سے ماخوذ تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ان میں ایک نہایت شاندار ڈرامہ ''صلاح الدین ایوبی'' اور ایک شاعرانہ اور دل گداز ڈرامہ ''عفیف'' تھا۔

داستان گوئی

موجودہ مغربی تہذیب میں جو حیثیت ایک بلند پایہ اداکار کو حاصل ہے وہ اسلامی تہذیب میں بلند مرتبہ داستان گو کو حاصل تھی۔ داستان گو ایک اول درجہ کا فن کار ہوتا تھا۔ اس جماعت نے اپنی صلاحیت و ہنر سے ایسی دل کش، حیرت انگیز اور سبق آموز قصوں کی دُنیا قائم کر دی جس کا معمول کی زندگی سے نہایت گہرا تعلق تھا۔ داستان گوؤں کے کہے ہوئے قصے کتابی صورت میں مرتب ہو چکنے کے بعد مشرق میں ادب کے درجہ تک پہنچ گئے۔ اگرچہ کہیں کہیں تعلیم یافتہ لوگوں نے انھیں خالص عربی طرز کی

افسانہ نگاری یعنی مقامات کے مرتبہ تک پہنچانے کی کوشش کی۔ مقامات کا تقریباً وہی مفہوم ہے جو ''سمر'' کا ہے اور ''سمر'' ایسے قصے کہانی کو کہتے ہیں جو عوام کی خوشی و مسرت کے لیے بیان کیے گئے ہوں۔ دونوں الفاظ کے معنی تفریح کی غرض سے راتوں کو بیٹھنا ہے۔ لیکن ''مقامہ'' کے معنی ہیں امرا کے محلات میں تفریح کے لیے رات کو بیٹھنا اور ''سمر'' کے معنی ہیں قہوہ خانوں میں یا گلیوں کے موڑوں پر تفریح کے لیے رات کو محفل جمانا۔ جب میں پہلی مرتبہ قاہرہ اور دمشق گیا تو وہاں ''مقامہ'' اور ''سمر'' دونوں رائج تھے۔ الحریری نے اپنی مشہور تصنیف ''مقامات'' کا خیال اور اپنے مشہور بدقماش ہیرو کا نام ابوزید الحجازی سے 'جو سفری داستان گووؤں میں ایک بلند مقام رکھتا تھا' لیا ہے۔ بہترین اور مشہور ترین تو ''الف لیلہ ولیلہ'' کے نام سے مشہور ہے۔ جسے مغرب میں عربی ادب کا شاندار کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔

وِلفریڈ بلنٹ نے اپنی کتاب ''گھوڑی کی چوری'' میں ابوزید کے سلسلۂ داستان ہی کے ایک حصے کا ترجمہ کیا ہے۔ لیکن اسی قسم کے اور بہت سے سلسلے ہیں جن میں اکثر اب عربی زبان میں شائع ہو چکے ہیں۔ مثلاً زمانۂ جاہلیت کے شاعر ہیرو عنترہ کا قصہ جسے عرب کا ہرکولیس کہا جاتا تھا اور سیف بن ذیزن یعنی اس پادری کا سلسلۂ داستان جو دریائے نیل کو قاہرہ تک لے آیا...... وغیرہ۔

اگر اس روایت میں دروغ بیانی کا شائبہ نہیں تو ''عنترہ'' کی تصنیف ایک بہترین ادبی شاہکار ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ مصر کے بادشاہ کے محل میں کوئی نہایت غیر شریفانہ واقع رونما ہوا اور قاہرہ کی گلیوں میں اس شرمناک واقعہ پر خوب تبصرے ہونے لگے اور تشہیر ہونے لگی۔ عوام کو مزے کی گفتگو اور دلچسپ مشغلہ ہاتھ آ گیا اس پر شاہِ مصر نے عوام کی توجہ کا رخ کسی اور طرف موڑنے کے لیے اس زمانہ کے بہترین داستان گو سے فرمائش کی کہ وہ کوئی دلچسپ کہانی تصنیف کرے اور داستان گووؤں میں تقسیم کرے۔ اس نے عرب کے مشہور ہیرو ''عنترہ'' کا قصہ منتخب کیا جس کی نظم کا دلکش مطلع تھا:

هل غادر الشعراء من متردم

او هل عزمت الدار بعد توهم

اس کا شمار عرب کے سات بہترین قصیدوں یعنی معلقات میں ہوتا ہے اس نے اپنے قصہ کو ایک طویل صورت میں مرتب کیا جس سلسلہ کی ہر کڑی نہایت ہی پر تجسس اور صبر آزما مقام پر ختم ہو جاتی تھی۔ وہ داستان گو مصنف اس سلسلہ کی ایک ایک قسط داستان گوؤں کو دیتا تھا اور وہ ہر روز ان لوگوں کو جو ان کی شمعوں کے گرد رات کو اکٹھے ہو جایا کرتے تھے' سنایا کرتے تھے اور انھیں سحر زدہ کیا کرتے تھے۔ اس سلسلہ کی دلچسپی اور دلکشی نے جلد ہی شاہی محل میں رونما ہونے والے اس شرمناک واقعہ کی طرف لوگوں کی توجہ ہٹا دی اور عوام اس نئے افسانے میں گم ہو کر رہ گئے۔ ایک شخص کے متعلق جس نے عنترہ کے قصے کو دمشق کی گلیوں میں اس کی قاہرہ میں تصنیف کے صدیوں بعد سنا' کہا جاتا ہے کہ وہ اس رات اس سوچ وفکر میں بالکل نہ سو سکا کہ عنترہ کا اپنے دشمن ایرانیوں کے چنگل میں پھنس کر کیا حال ہوا ہوگا وہ کس طرح ان کی قید سے نکل بھاگا ہوگا۔ داستان گو نے قصہ کو ایک حد درجہ پر تجسس اور صبر آزما مقام پر اس طرح ختم کیا جسے آج کل کے سلسلہ وار کہانیاں لکھنے والے کرتے ہیں۔ اس شخص کے تجسس و حیرت' شوق اور بے تابی کا یہ حال تھا کہ وہ آدھی رات کو اس داستان گو کے گھر پہنچا۔ اس نے اسے جگایا۔ انعام پیش کیا اور اپنی تسلی وتسکین کے لیے کہانی کا اگلا حصہ سنا تب کہیں جا کر اس قرار آیا اور سکون کی نیند نصیب ہوئی۔

یہ قصے کہانیاں جن میں روایات و ادب کی سرحدیں مل جاتی تھیں۔ مسلمانوں کے لیے تفریح کی ایک صورت ضرور تھیں۔ لیکن مسلمانوں نے انھیں حقیر جانا اور اسے جاہلوں اور کاہلوں گپ بازوں کے لیے مخصوص سمجھا۔ لیکن آج ہم ان چیزوں کو بنظر حقارت نہیں دیکھ سکتے۔ کیونکہ ان ہی چیزوں کو آج ہم مغرب میں ادب کی ایک نہایت ہی اہم صنف یعنی افسانہ نگاری کا سرچشمہ سمجھتے ہیں۔

تعمیرات

میرے پاس اسلامی تہذیب کے تعمیراتی کمالات کے متعلق کچھ کہنے کے لیے موزوں الفاظ نہیں ہیں۔ قرطبہ کے بڑے بڑے محلات سے لے کر دیوارِ سمرقند تک' الحمراء سے تاج محل تک' دجلہ کے اس پار ایک بلند پہاڑی پر ایک ولی اللہ کے مقبرے سے قاہرہ اور قیروان کے گنبدوں اور یروشلم میں چٹان کی چھت تک جسے حال ہی میں ایک جرمن ماہرِ تعمیرات نے موجودہ زمانے کی بہترین عمارت قرار دیا ہے۔ ان ممالک کی طرح جو مسلمانوں کے زیرِ نگین آئے' یہ یادگاریں فنِ تعمیر کے متنوع نمونے پیش کرتی ہیں۔ ان تمام اسلامی تعمیرات میں ایسے نمونے موجود ہیں جو اقوامِ عالم کو ورطۂ حیرت میں ڈالنے کے لیے کافی ہیں۔ مساجد' محلات' قلعے' مکتبے' شفا خانے' تفریح گاہیں' اور باغات کیا کیا کچھ انھوں نے نہیں بنایا۔ حق یہ ہے کہ اسلامی فنِ تعمیر نے حسن و جمال کے متوالوں کے لیے ایک ہمہ گیر اور لازوال فردوسِ نگاہ مہیا کر دی ہے۔ اپنے اچھے دنوں میں بھی مسلمان حسن و جمال کے پرستار تھے' نقشہ کی خوبی' خاکے کی عمدگی اور رنگوں کی دل کشی سب وہ پیشِ نظر رکھتے تھے۔ چونکہ بت گری معیوب تھی اس لیے انھوں نے حسنِ فطرت کی طرف ہی توجہ دی۔ مسلمانوں کی تعمیرات میں ایک خوش نما ترتیب اور فطرت کے ساتھ ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ اسلامی عمارات اپنے ماحول سے مکمل مطابقت رکھتی ہیں۔ ان کی محراب دار عمارتوں کی دلکشی اور مسقف بازاروں کی دل فریبی چٹانوں یا ساحل سمندر کی غاروں سے مشابہہ ہے۔ جن میں ساز و سامان کی چمک دمک سمندر کے اندر کی چیزوں کی جھلک سے مشابہہ دکھائی دیتی ہے۔

سائے میں سادگی اور وقار' دھوپ میں استحکام اور رنگینی' نزاکت'' شان و شوکت اور حسن و جمال دُنیا بھر میں اسلامی فنِ تعمیر کی امتیازی خصوصیات گنی جاتی ہیں۔ ظلمت کدۂ یورپ کو عرب خلفاء' ترک سلاطین اور مغل شہنشاہوں سے بہتر تعمیرات کے شیدائی و مربی' باغات کے شوقین اور مناظر کے متوالے کبھی نصیب نہیں ہوئے۔ تاج محل کی حقیقت سے آپ سب آگاہ ہیں لیکن اشبیلیہ کے بادشاہ معتمد کی داستان سے ممکن ہے کہ

آپ میں سے بیشتر لاعلم ہوں۔ کہ اس نے اپنی ملکہ کو خوش کرنے کے لیے کیا کام کیا۔ ایک مرتبہ سفر کے دوران ملکہ نے پہاڑوں کی چوٹیوں پر جمی ہوئی برف کی تعریف کی۔ اس پر معتمد نے قرطبہ کی تمام پہاڑیوں پر بادام کے درخت اگوا دیئے۔ (ہر سال موسم بہار میں ان درختوں پر سفید سفید پھول کھلتے تھے) تاکہ موسمِ بہار میں ملکہ پھولوں سے کھلے ہوئے جنگل میں ان پہاڑیوں پر برف کے نظارے سے لطف اندوز ہو سکے۔ ترکی اور ایرانی باغات کے حسن و دلکشی کی یاد انسان کے دل سے کبھی محو نہیں ہو سکتی۔ اور میں باغات کو بھی تعمیرات میں شمار کرتا ہوں۔ اس لیے کہ قدیم یونانی باغات کی طرح مسلمانوں کے باغات بھی عمارتوں کے انداز میں ترتیب دیئے جاتے تھے۔

خطاطی

مسلمانوں نے خطاطی یا خوش نویسی میں نہایت ہی دلکش و دل فریب طرائق پیدا کیے۔ خطاطی کے ان حسین نمونوں کا وجود دراصل فنِ مصوری پر مختلف قدغنوں کا رہن منت ہے۔ پچی کاری کا دلکش فن اور پتھروں پر پھول پتوں کی دل فریب نقاشی بھی اسلامی تعمیرات کا طرۂ امتیاز ہیں۔ مصوری پر پابندی کی بدولت فن خطاطی معرضِ وجود میں آئی۔

ظہورِ اسلام سے قبل عرب میں ادب کی صرف ایک ہی صنف کا وجود تھا یعنی شعر کا۔ زمانۂ جاہلیت کے عربوں کی شاعری بڑی بلند پایہ تھی۔ اسی وجہ سے بعض مستشرقین زمانہ جاہلیت کے چند شاعروں کو اسلامی عہد کے ہزاروں شعراء پر فوقیت دیتے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ چرواہے کی بانسری کو ایک دلکش آرکسٹرا پر ترجیح دینے کی اس سے بہتر مثال اور کیا ہو سکتی ہے میرا شمار بھی ایسے ہی لوگوں میں ہوتا ہے۔ زمانۂ جاہلیت کی شاعری میں ایک سوز و گداز ہے۔ جو میرے لیے انتہائی متاثر کن ہے۔ لیکن بلحاظ وسعت و ثقافت عہدِ جاہلیت کے شعرا امرالقیس، عنترہ، کعب بن زہیر، ابوطیب المتنبی کا کسی دوسرے مسلمان شاعر سے کیا مقابلہ ہے۔ اسلامی تہذیب میں شاعری سوائے گنتی کے چند لوگوں کے کسی کے لیے کوئی عطیۂ خدا داد نہ تھا۔ یہ تو سب لوگوں کے لیے تفریح و مسرت کا ذریعہ تھی۔ شعراء کی اس قدر کثرت تھی کہ اعلیٰ درجہ کے عربی، ایرانی اور ترک

شاعروں کے ناموں ہی کی فہرست تیار کرنے کے لیے کئی ضخیم جلدیں درکار ہونگی۔

تراجم

مسلمانوں نے قدیم یونانی اور لاطینی کتب کے جو تراجم کیے اور ان کی جو شرحیں لکھیں وہ ایک شاندار کارنامہ ہے جس کی بدولت بنی نوع انسان کی ایک بڑی خدمت ہوئی۔ اور جن تراجم کی بدولت علمِ قدیم کی شمع ہزار سال یورپ میں روشن رہی اگرچہ ان تراجم کی فہرست نہایت طول وطویل ہے لیکن میں انھیں اسلامی تہذیب کی تخلیق نہیں سمجھتا۔ اخلاق پر تصانیف کی ایسی کثرت ہے کہ اخلاقیات ادب کی ایک جداگانہ شاخ قرار پا گئی ہے جس کا نفسِ مضمون اور طرزِ بیان تقلیدی ہے۔ عربوں کو اس کا ہمیشہ شوق رہا اور الفاظ کے دلکش اور پر وقار زیر و بم کے وہ ہمیشہ شیدائی رہے۔

فلسفہ پر مسلمانوں نے بکثرت دلچسپ تصانیف چھوڑی ہیں جن میں سے امام غزالیؒ کی طرح بہت سی آج بھی ہمارے گہرے مطالعہ کی حق دار ہیں۔

تاریخ

تاریخ کو تو گویا مسلمانوں نے ہی پروان چڑھایا اور ترقی دی ہے۔ مسلمانوں سے پہلے تاریخ، جیسا کہ یورپ میں اسے کہا جاتا تھا خاندانوں، سالوں اور جنگوں کے نقشوں سے زیادہ اور کچھ نہ تھی، جنھیں طالب علم کے زبانی یاد کرنے کے لیے آسان صورت میں مرتب کر دیا جاتا تھا۔ لیکن مسلمانوں کی بدولت دُنیا کا دامنِ علم آج بے شمار ایسی تاریخی کتب سے مالا مال ہے جن میں ایسی تفصیلات اور جزئیات موجود ہیں جن سے متعلقہ زمانے کے رسوم ورواج اور فطرتِ انسانی سے متعلق معلومات میسر ہیں۔ اور جن سے مصنفین کی وسعتِ نظر اور آزاد خیالی کا علم ہوتا ہے۔ ان عرب مورخین میں سے، جنھوں نے میرے لیے راحتِ قلب کا سامان مہیا کیا ہے، عمارہ جو یمن میں زبید اور صنعاء کا مورخ ہے اس کے بعد کتاب الفخری ہے پھر ابن الاثیر ہے۔ ان کے بعد ابن خلدون ہے جس کا نظریہ تاریخ ایسا ترقی یافتہ ہے کہ اسے پڑھتے ہوئے انسان کو یاد نہیں رہتا کہ

وہ کئی صدیوں پہلے کی کسی تصنیف و تاریخ کا مطالعہ کر رہا ہے۔ احمد الجبرتی مصری مورخ کو بھی نہیں بھولنا چاہیے۔ جس کی ضخیم تصانیف بے حد دلچسپ ہیں۔ اس نے مصر پر فرانسیسی حملے اور محمد علی پاشا کا زمانہ پایا۔ ان مصنفین کو اہل یورپ لادین مورخین کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

ان کے علاوہ مسلمان مورخین کی ایک بڑی جماعت ہے جس کی مساعی تاریخِ اسلام ہی کی ترتیب و تدوین کے لیے وقف رہی ہیں۔ میں اسماعیل ابوالفدا کا بڑا پرستار ہوں۔ مجھے انتہائی بلند پایہ اور عالم و فاضل مورخین میں مورخِ یروشلم مجدالدین سے بھی گہری عقیدت ہے۔

مسلمانوں نے بہت سے سفرنامے بھی تحریر کیے ہیں جن میں ابن بطوطہ کا سفرنامہ سب سے مشہور ہے۔ اگرچہ صداقت و دلکشی کے لحاظ سے وہ صف اوّل کے سفرناموں میں شمار کیے جانے کے قابل نہیں۔

ادب کے مخصوص اصناف

اب میں آپ کی توجہ ادب کی اس مخصوص اصناف کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں جو اسلامی ادب کے دائرہ کے باہر ناپید ہیں۔ میرا مطلب مجموعۂ احادیث نبویؐ سے ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاداتِ گرامی کے مجموعے اغلاط سے پاک معرا بھی ہیں اور ترجمہ شدہ بھی۔

ان تصانیف کی خصوصیت یہ ہے کہ ان کے جمع کرنے والوں نے جو کچھ سنا' اسے جانچا' پرکھا اور ایسی روایات کو رد کر دیا جو ان کی کسوٹی پر پوری نہ اُترتی تھیں۔ پہلے جمع کرنے والوں کے کام کو بعد میں آنے والون نے جانچا پرکھا۔ ہر حدیث کے مستند ہونے پر تحقیق و جستجو کی گئی۔ اگر کسی حدیث کے مستند ہونے میں کوئی خامی پائی گئی تو اسے ضعیف قرار دے دیا گیا تھا۔ سُنّی مسلمان چھ کتبِ احادیث کو مستند و معتبر مانتے ہیں۔ ان میں صحیح بخاری اور صحیح مسلم سب سے مشہور ہیں۔

فقہ

مسلمانوں کے ادب کی ایک دوسری مشہور ترین صنف فقہ ہے۔ جو اصولِ حکومت، سیاسی، معاشرتی قوانین، روز مرہ کے معمولات و مصروفیات سے متعلق قوانین ہیں۔ جن میں مثالیں دے کر سمجھایا گیا ہے۔ اس میں عبادات کے بارے میں بھی بتایا گیا ہے کہ نماز میں ہاتھ کس طرح باندھنے چاہئیں۔ اس میں میاں بیوی کے باہمی تعلقات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ علم اس خاص ملّائیت کا تخلیق کردہ ہے جسے میں نے اسلامی اداروں کے تنزل کا سبب قرار دیا ہے۔ فقہا یہ چاہتے تھے کہ اس دُنیا کی روشنی کے بغیر قرآنِ پاک کی اکملیت ثابت کریں۔ انھوں نے کھال کو تو لے لیا مگر مغز کو چھوڑ دیا۔

انھوں نے معمولی اور چھوٹی باتوں میں بال کی وہ کھال اُتاری کہ ان کی بعض باتیں آج کل قابلِ توجہ ہی معلوم نہیں ہوتیں۔ لیکن جیسا کہ غلطی سے بعض لوگوں کا خیال ہے انھیں نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ فقہ کو میدانِ علم کا ایسا نقشہ سمجھنا چاہیے جس پر مسلمانوں کی کامرانی کا دارومدار ہے۔ جس طرح کیمیا میں تحقیق و جستجو کا نتیجہ کیمسٹری جیسے مفید علم کی بنیاد کی صورت میں ظاہر ہوا اسی طرح ایک غلط مقصد یعنی مسلمانوں کی باقی دُنیا سے کنارہ کشی اور دین و دُنیا کے درمیان اس دیوار کو دوبارہ اُٹھانے کی کوشش جسے اسلام نے مسمار کر دیا تھا، فقہا نے اپنی دماغ سوزی سے اس طویل عرصہ میں اسلامی تعلیمات کا ایک سمندر کھنگال ڈالا اور اس کے موتیوں اور سیپیوں میں درجہ بندیاں کر دیں۔ فقہ کے قوانین کبھی ساکت و جامد نہیں رہے۔ ان میں حرکت اور زندگی لہریں لیتی رہی ہے۔ صرف اس حقیقت کا اعتراف ہی فقہ کو مسلمانوں کی بیش بہا چیز کا درجہ دلوانے کے لیے کافی ہے۔

قواعد و انشاء

عربی قواعد و انشاء ایک وسیع صنفِ ادب ہے جو مسلمانوں کے نزدیک علومِ کاملہ

میں شمار ہوتا ہے۔ یہ ایک روکھا پھیکا سا مضمون نہیں جیسا کہ بعض لوگ سمجھتے ہیں۔ اس کی دلکشی کا تو یہ عالم ہے کہ جن معدودے چند مستشرقین نے اسے سمجھنے سیکھنے کی کوشش کی انھیں اس کی خاطر اپنی زندگیاں وقف کر دینے میں بھی کوئی تامل نہ ہوا۔ اسلام کی حلقہ بگوشی کی سعادت حاصل کرنے والی اقوام میں کسی کی زبان کی ہیئت و ترکیب میں عربی زبان جیسی گہرائی اور مضبوطی نہیں پائی جاتی۔ اس لیے ان میں سے کوئی زبان اس سخت قسم کی جستجو و جائزے کی متحمل نہیں ہوسکتی جو اس زبان (عربی) کا لیا جا رہا ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ اس تحقیق و جائزے کا مواد ویسے کا ویسا ہی برقرار ہے۔ اس زبان کے بے شمار کرشمے ہیں جو دل پر گہرا اثر ڈالتے ہیں۔ اس کی بے شمار خوبیاں ہیں جو ذہن کے سامنے نمودار ہوتی چلی جاتی ہیں۔ اس سلسلہ میں نئے حل طلب مسائل پیدا ہوتے رہتے ہیں اور نئے انکشافات کا وسیع میدان سامنے رہتا ہے۔ مسلمان اقوام میں صرف ترک ہی ایک حد تک عربی قواعد و انشاء کو اختیار کر سکے ہیں اور اس کی غالب وجہ ترکی زبان میں افعال بالخصوص مصادر کا حیرت انگیز نظام ہے۔

اس علم کو مطالعہ اور قرآن فہمی سے قریبی تعلق کی بنا پر مسلمان قوموں میں ایک خاص مقام حاصل رہا ہے۔ براؤننگ نے انگریزی قواعد کو اپنی نظم ''قواعد دان کا جنازہ'' میں جو مقام بخشا ہے وہ کسی عربی نحوی کے جنازے پر کسی مسلمان شاعر کی نظم کا نہایت ہی موزوں موضوع ہوسکتا ہے۔ عربوں کی صرف نحو کے جامع علم کے مقابلے میں تو اہلِ یورپ خصوصاً ہم انگریزوں کے پاس گویا قواعد کا ہونا یا نہ ہونا ایک ہی بات ہے۔

تصوف

اس نہایت ہی خوب صورت اور وسیع موضوع پر میں نے چند حوالے دینے پر ہی اکتفا کیا ہے۔ اب اختتام پر میں ادب کی ایک اور قسم کا ذکر کرنا چاہتا ہوں اور یہ قسم بہت سی شاخوں میں تقسیم ہے اور وسیع دامن رکھتی ہے۔ میری مراد تصوف سے ہے جس کی وساطت سے انسان اللہ تعالیٰ سے بلاواسطہ طور پر تعلق قائم کر سکتا ہے۔ زمانۂ جدید کے بہشت سے مغربی مصنفین تو خدا کے وجود ہی سے منکر ہیں۔ مسلمان ایسا ہرگز نہیں سمجھتا

کیونکہ اللہ تعالیٰ پر اس کا ایمان محض اس کے اعتقاد کی وجہ نہیں۔ اس کے ذاتی تجربہ اور احساس پر بھی مبنی ہے۔ صوفیاء نے اس تجربے کو اس ناقدانہ صحت کے ساتھ بیان کیا ہے جس سے طبعی علوم کی تحقیقاتی سوسائٹی بھی مطمئن ہو جائے۔

آج جب کہ مغربی دُنیا عالمِ ارواح کے مظاہروں اور ان کے ساتھ تعلق قائم کرنے میں دلچسپی لے رہی ہے، میں سمجھتا ہوں کہ یہ طبعی علم اس سے زیادہ توجہ کا حق دار ہے جو اس پر دی جا رہی ہے۔ میں اسے طبعی سائنس ہی سمجھتا ہوں۔ جس کا مدعا انسان کی حیثیت میں بلندی اور اس کے ذہن کی گہرائی اور رسائی کو وسعت دینا ہے اور یہی ہر سائنس کا مقصد ہے۔ بہترین فلسفہ اور حکمتِ عمیق ترین تخیلات اور سرور انگیز نظمیں جو اسلامی ثقافت کی تخلیق ہیں اور صنفِ ادب میں موجود ہیں۔ میں ذاتی طور پر عربی اور ترکی تصوف کا علم رکھتا ہوں۔ عجمی تصوف زیادہ مشہور ہے اور زیادہ تر اسی کو مشہور کیا جاتا ہے۔ لیکن عرب اس کے غالب حصے کو محض تخیل کی پرواز کا نام دے کر ردّ کر دیں گے۔ عربوں کی نظر میں عجمی تصوف میں خیال کی وہ سنجیدگی، متانت اور پاکیزگی جو اس بلند پایہ مضمون کے لیے ضروری ہے، نہیں پائی جاتی۔ اس میں شک نہیں کہ عجمی صوفیاء میں سے اکثر راہِ راست سے بھٹک کر لوگوں کی گمراہی کا باعث بنے۔ عربی تصوف نے کبھی ایسی صورتِ حال کی نوبت نہ آنے دی۔ حقیقت یہ ہے کہ ایران اپنی متنوع ثقافت اور شان دار شاعری کے باوجود غیر اسلامی تصوف کا مرکز رہا ہے۔ عجمی تخیل حقیقت کی قربانی پر بھی کیف ونشاط کا طالب ہے بخلاف اس کے عربی اور ترکی یاس وحسرت کی تلخیوں کے باوجود حقیقت کے متلاشی ہیں۔ اصل تصوف شریعت کی روح ہے اور نیک نہاد صوفیاء نے اس زمانے میں شریعت کی روح کو زندہ رکھا جب مسلمانوں کی اکثریت کو محض قانونِ شریعت ہی دکھائی دیتا تھا۔

مغربی علومِ ارواح کے جاننے والوں سے میں درخواست کروں گا کہ وہ عربی تصوف کے مطالعہ کی طرف توجہ دیں۔ کیونکہ یہ لوگ بعد از موت کی شہادت حاصل کرنے کے لیے مردوں کی روحوں سے رابطے پیدا کرنے کی گھٹیا کوششیں کرتے ہیں۔ تصوف کا

مطالعہ ان پر واضح کر دے گا کہ صرف ایسے مردوں کی روحیں ان کے بلاوے کا جواب دے سکتی ہیں جن کے گناہ انھیں مرنے کے بعد کچھ مدت کے لیے اس دُنیا سے ایک طرح منسلک رکھتے ہیں۔ اس سائنس کا مطالعہ ان میں بلند تر مقصد پیدا کر سکتا ہے اور انھیں بہت سی ناکامیوں اور مایوسیوں سے محفوظ رکھ سکتا ہے۔

اسلامی ادب اور فنون تو اسلام کے تاریک ترین ادوار میں بھی زندہ رہے۔ طبعی علومُ البتہ دو صدیوں کے بعد بالکل مردہ ہو گئے۔ انیسویں صدی کے نصف آخر میں اسلامی ادب کی نشاۃِ ثانیہ کا آغاز ہوا۔ مطابع کی ایجاد کے ساتھ ہی ترکی شام اور مصر میں ادبی تاریخ کے اہم اور نئے باب کا آغاز ہوا۔ مصر اور شام میں ادب کی تمام اصناف' جن کا میں نے تذکرہ کیا ہے' یعنی فقہ اور تصوف سے لے کر داستان گوئی تک ہر ایک میں نیا رنگ آ گیا اور یورپ کے اچھے برے ہر قسم کے تراجم کا ایک سیلاب اُمڈ آیا۔ لیکن عہدِ جدید کی ان تصانیف و تالیفات میں سب سے زیادہ اثر اور قبولیت مقبولِ عام پیرایہ میں تحریر کردہ فقہ کی کتابوں کے حصہ میں آئی۔ اس سلسلہ میں سعد حلیم پاشا کے مختصر سے شاہپارے ''اسلام شمق'' (اسلامی بنالو) کو بے حد مقبولیت و پذیرائی حاصل ہوئی۔ یہ کتاب ترکی زبان میں لکھی گئی اور عربی زبان میں اس کا ترجمہ ہوا۔ اس کتاب میں یہ بتایا گیا ہے کہ زمانۂ حال کی کسی مملکت کو شرعی اصولوں پر چلانا اور اسے حکومتِ الٰہیہ کا جامہ کس طرح پہنانا چاہیے۔ مسلمانوں کو بتایا گیا ہے کہ ان کو اپنی گم کردہ شان و شوکت اور اقبال مندی صرف صحیح اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا ہو جانے ہی سے دوبارہ واپس مل سکتی ہے۔ کیونکہ ان تعلیمات سے انحراف ہی ان کے زوال و ادبار کا موجب بنا ہوا ہے۔

ہندستان میں بھی ہمیں اسلامی ادب کا احیاء فقہ کے متنازع مسائل ہی میں نظر آ رہا ہے۔ حیدرآباد میں ایک جدید ثقافت کی بنیادیں جو جدید ادب کی ایک نئی زبان یعنی اُردو سے وابستہ ہیں' جو عالمِ اسلام کی چوتھی بڑی زبان سمجھی جائے گی' اس مسلم فرمانروا کے ہاتھوں مضبوط و مستحکم کی جا رہی ہیں جس کی خدمت میرے لیے باعثِ صد فخر و افتخار

ہے (نظام حیدر آباد)۔ عالمِ اسلام میں ہر جگہ ایک نئے دور کی ابتدا اور ایک نشاۃِ ثانیہ کا غلغلہ بلند ہو رہا ہے۔ اللہ سے دعا ہے کہ عالم اسلام کی اس حیاتِ نو کی بدولت اسلام کو وہ عظمت اور سربلندی نصیب ہو جائے کہ وہ دُنیا میں دوبارہ اپنے مقصد کی تکمیل میں کامیاب ہو۔

خطبۂ پنجم

رواداری

رواداری کا مطلب ہے اعلیٰ درجے کی شائستگی، شرافت اور رکھ رکھاؤ۔ مغربی مصنفین نے مسلمانوں کی تاریخ اور مذہب اسلام کے خلاف الزامات کے پہاڑ کھڑے کر رکھے ہیں۔ ان میں عدم رواداری یا تعصب سب سے بڑا اور سنگین الزام ہے۔ اصل حقیقت اور اس الزام پر غور کرتے ہوئے اس کے بے بنیاد اور بے سروپا ہونے کی تصدیق ہو جاتی ہے۔ تاریخِ عالم پر اگر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ تعصب اور عدم رواداری کس کا شیوہ رہا ہے۔ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ ہسپانیہ، سسلی اور اپولیا میں مسلمانوں کا ایسا قتلِ عام ہوا کہ اب وہاں کوئی مسلمان نہیں دکھائی دیتا۔ ان کی مساجد کی بھی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی۔ کیا یہ ایک تاریخی حقیقت نہیں ہے کہ بلقان میں مسلمانوں کی بھاری تعداد کو یورپی ممالک کی تائید و حمایت کے ساتھ بڑی بے رحمی اور شقاوتِ قلبی سے اقلیت میں بدل دیا گیا۔ اس حقیقت سے کیسے انکار ہو سکتا ہے کہ عیسائی رعایا کو مسلمان حاکموں کے خلاف بغاوت اور مسلمانوں کے قتلِ عام پر اُکسایا گیا اور مسلمانوں کی طرف سے اس صورتِ حال کے تدارک کی کوشش کو ظلم و زیادتی کا نام دیا گیا۔ اس تاریخی حقیقت سے کون صرفِ نظر کر سکتا ہے کہ یورپ بھر میں یہودیوں کو ازمنۂ وسطیٰ میں نہایت بھیانک اور لرزہ خیز مظالم کا سامنا کرنا پڑا۔ کون نہیں جانتا کہ ہسپانیہ سے مسلمانوں کی بے دخلی کے بعد یہودیوں پر کیا گزری۔ پرانے قصوں کو چھوڑیئے زار کے روس میں اور پولینڈ میں زمانۂ حال ہی میں مدعیانِ تہذیب کے ہاتھوں

یہودیوں کی جو درگت بنی اسے کارِ ثواب ہی سمجھا گیا۔ عیسائیوں اور یہودیوں کو اسلامی سلطنت میں نہ صرف مذہبی آزادی حاصل تھی بلکہ انھیں اپنے قومی امور میں مکمل خود اختیاری بھی حاصل تھی۔

ہسپانیہ میں خلفائے بنی اُمیہ اور بغداد میں خلفائے عباسیہ کے عہد میں عیسائیوں اور یہودیوں کو مسلمانوں کے مدرسوں اور دانش گاہوں میں داخل ہی نہیں کیا جاتا تھا بلکہ سرکاری خرچ پر اقامت گاہوں میں ان کے قیام و طعام کا انتظام بھی کیا جاتا تھا۔ جب ہسپانیہ سے مسلمانوں کی بے دخلی عمل میں آئی تو عیسائی فاتحین نے یہودیوں کو ایک دردناک مذہبی عقوبت میں مبتلا کر دیا۔ ان یہودیوں میں سے جو جان بچا کر بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوئے ان میں سے کچھ مراکش پہنچے اور سیکڑوں ترکی کی وسیع و عریض سلطنت میں پناہ گزین ہوئے جہاں ان کی اولادیں آج بھی پھل پھول رہی ہیں۔ یہ لوگ آج بھی قدیم ہسپانوی زبان میں گفتگو کرتے ہیں۔ اس زمانے کا عالمِ اسلام مذہبی تعزیرات سے بھاگنے والوں کے لیے ایک پناہ گاہ تھا۔ اسلامی دُنیا میں عیسائیوں اور یہودیوں کی حیثیت بلاشبہ مسلمانوں سے کم درجے کی تھی۔ لیکن یہ حالت اس زمانے کے یورپ میں مسلمانوں یہودیوں اور کافروں تو درکنار اعلیٰ مرتبت علماء کی حیثیت سے بھی بدرجہا بہتر اور قابلِ رشک تھی۔

یورپی عیسائیوں کو اٹھارویں صدی کے ''بحرالعلوم'' کے مرتب کرنے والوں سے پہلے نہ مسلمانوں کے معتقدات کے بارے میں کوئی علم حاصل تھا نہ ہی وہ اس کے خواہاں تھے۔ وہ مشرقی عیسائیوں کے مسلمانوں کے بارے میں خیالات جاننے کے آرزومند بھی نہ تھے۔ مسیحی کلیسا دو فرقوں میں بٹ چکا تھا اور ان کے درمیان عناد و اختلاف اس حد تک ترقی کر چکا تھا کہ بقول گبن: مشرقی عیسائی مسلمانوں کے زیرِ سایہ زندگی بسر کرنے کو' جہاں انھیں ہر طرح کی ضمیر و عقیدہ ہی میں نہیں بلکہ اپنے مذہبی شعائر کی ادائیگی کی بھی آزادی حاصل تھی' عیسائیوں کی سلطنت میں رہنے پر ترجیح دیتے تھے۔ کیونکہ انھیں معلوم تھا کہ اپنے مسیحی بھائیوں کے زیرِ حکومت انھیں یا تو تبدیلیٔ مذہب یعنی رومن کیتھولک بن

جانے پر مجبور کیا جائے گا یا پھر ہلاکت ان کا مقدر ہوگی۔ مغربی عیسائی تو مسلمانوں کو کافر اور بت پرست کہتے تھے۔ ان کی بہت سی کتابوں میں انھیں محمدؐ کے بت کا پجاری بتایا گیا ہے۔ غرناطہ کی تسخیر کے حالات میں تو ان خوف ناک بتوں کی تفصیل بھی موجود ہے جن کی مسلمان پوجا کرتے تھے۔ اس عجیب وغریب غلط فہمی کے مقابلے میں مسلمانوں کو حقیقتِ عیسائیت اور اسلام اور عیسائیت کے اختلاف سے مکمل واقفیت حاصل تھی۔ اگر اس زمانے میں یورپ کو اسلام کے متعلق اتنی ہی معلومات حاصل ہوتیں جتنی مسلمانوں کو عالمِ عیسائیت کے متعلق حاصل تھیں تو صلیبی محاربات، جن میں کبھی کبھار شرافت وشجاعت کی جھلک دکھائی دے جاتی ہے، لیکن جو بجز مذہبی جنون کچھ نہ تھے، کبھی شروع نہ ہوتے۔ کیونکہ یہ مذہبی جنون ایک سراسر غلط فہمی اور حماقت کا نتیجہ تھا۔ اس بارے میں ذرا سنیے کہ ایک معروف فرانسیسی مصنف کیا کہتا ہے:

"مسیحی دُنیا کا ہر شاعر مسلمانوں کو کافر اور بت پرست کہتا تھا جن کے تین بت مہاوند، اپالین اور ترموگان تھے۔ کہتے تھے کہ جب عیسائیوں نے ہسپانیہ فتح کر لیا اور انھیں باہر بھگا دیا تو وہ (مسلمان) موقع پا کر واپس لوٹے انھوں نے اپنے بتوں کو توڑ پھوڑ دیا۔ ایک عیسائی شاعر کہتا ہے مسلمانوں نے اپنے دیوتا اپالین کے بت کو، جو ایک کوٹھڑی میں چھپایا ہوا تھا بری طرح سے مارا پیٹا، اسے گالیاں دیں، اس کی مشکیں کسیں اور اسے پھانسی پر لٹکا کر لاٹھیاں مار مار کر توڑ دیا اور اس کے ملبے کو پاؤں تلے روند کر ریزہ ریزہ کر دیا۔ اپنے دوسرے دیوتا مہاوند کو انھوں نے ایک گڑھے میں پھینک دیا اور کتوں اور سؤروں سے اس کی تکا بوٹی کروائی۔ دیوتاؤں کی ایسی بے حرمتی شاید ہی کہیں دیکھنے میں آئی ہو۔ بعد میں مسلمانوں نے اپنی ان بداعمالیوں پر توبہ کی اور اپنے دیوتاؤں کے دوبارہ بت تراش کر انھیں عبادت خانوں کی زینت بنا دیا۔ پھر جب شاہ چارلس ساراغاشہ کے شہر میں داخل ہوا تو اس نے ان کے بت مہاوند کو اور دوسرے تمام بتوں کو ہتھوڑے کی ضربوں سے پاش پاش کر دیا"۔

یہ تھی مسلمانوں کی تاریخ جو مغربی عیسائیوں کے لیے تحریر کی جاتی تھی۔ یہ تھے وہ

خیالات جو صلیبی محاربات کے سپاہیوں کو اس زمانے کی متمدن و شائستہ ترین قوم کے خلاف بھڑکانے اُکسانے کے لیے ان میں پھیلائے جاتے تھے۔ عالمِ مسیحیت تمام بیرونی دُنیا کو جہنمی سمجھتی تھی جبکہ اسلام کی یہ تعلیم نہ تھی۔ عالمِ عیسائیت میں کچھ ایسے نیک دل اور باشعور لوگ ضرور موجود تھے جنھیں یہ غم کھائے جاتا تھا کہ صراطِ مستقیم سے بھٹکے ہوئے لوگ دینِ حقیقی کی طرف واپس لوٹنے کو تیار نہ ہو رہے تھے۔ وہ ان گمراہ اور ''ملعون'' لوگوں کو دامنِ مسیحیت میں لانا چاہتے تھے۔ اس کے سوا ان نیک نہاد لوگوں کی نظروں میں ان 'ملعون' وگم کردہ راہ لوگوں کے لیے اور کوئی راہِ نجات نہ تھی۔ آسائی کے سینٹ فرانسس کے وفد کا مسلمانوں کے پاس جانا اور اس وفد کی پذیرائی دونوں نظریات کے اختلاف کو ظاہر کرتا ہے۔ اسی طرح مصر کے خلاف سینٹ لوئی کا ''جہاد'' اس ذہنیت کی عکاسی کرتا ہے کیونکہ اس کا مقصد بھی مسلمانوں میں فتنۂ ارتداد کی آگ بھڑکانا تھا۔ اس نظریہ کی ایک نہایت دلچسپ مثال ''حلقۂ احباب'' یعنی ''کویکرز'' کے ریکارڈ میں موجود ہے۔ نومبر ۱۹۱۲ء میں 'مانچسٹر گارڈن' نامی اخبار میں بریسفورڈ نے اس پر ایک مضمون لکھا تھا۔

چارلس دوم کے زمانے میں ایک نوعمر انگریز خاتون جو خادمہ رہ چکی تھی 'حلقۂ احباب' کی رکن بن گئی اور اسی وجہ سے وہ سخت ترین تعزیرات کا نشانہ بنی۔ دو مرتبہ تو اسے کلیسا کے مروجہ آداب و رسوم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے پر کوڑوں کی سزا دی گئی۔ پھر جب وہ دو مرد کویکروں کے ساتھ تبلیغ و ہدایت کے لیے امریکہ پہنچی تو ان تینوں پر جادوگری کا الزام عائد کر کے جیل میں ٹھونس دیا گیا جہاں انھیں بے حد سختیاں اور تکالیف جھیلنے کے بعد بڑی مدت بعد رہائی نصیب ہوئی۔ برطانیہ واپسی کے بعد اس نوجوان خاتون کے دل میں عیسائیت کی تبلیغ کا ولولہ پیدا ہوا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ اسے سلطانِ ترکی کو دعوتِ عیسائیت دینی چاہیے۔ چنانچہ وہ اپنے پانچ ساتھیوں کے ہمراہ ترکی روانہ ہوئی۔ راستے میں اس کے پانچ مرد ساتھی مذہبی احتساب کی زد میں آ گئے۔ ان کے متعلق اب تک اتنا ہی معلوم ہو سکا ہے کہ ان میں سے ایک شخص جب برطانیہ پہنچا تو

اس کا دماغ خراب ہو چکا تھا۔ خود اس خاتون نے مذہبی تعزیرات اور اذیت رسانی اور ہر طرح کی رکاوٹوں اور پریشانیوں سے ہر دم دوچار ہوتے رہنے کے باوجود بڑے عزم و حوصلے کے ساتھ اپنا سفر جاری رکھا اور تن تنہا سفر کرتی رہی۔ وینس سے وہ بحری جہاز میں سوار ہوئی اور اسلامی سلطنت کے دارالحکومت سے بہت دُور موریہ جا اُتری۔ وہاں سے وہ پیدل سفر کرتی ہوئی ایڈریانوپل جا پہنچی۔ لیکن اس نے یہ زحمت ناحق ہی برداشت کی۔ اسلامی سلطنت میں قدم رکھتے ہی اسے کسی مذہبی تعزیر کا سامنا نہ کرنا پڑا۔ وہاں ہر شخص اس سے بے حد اخلاق اور مروت سے پیش آیا۔ سرکاری ملازمین نے اس کی بھرپور مدد کی اور اسے سلطان بایزیدؒ تک پہنچا دیا جو ان دنوں ایڈریانوپل میں مقیم تھے۔ اس نے سلطان کو پیغام بھیجا کہ وہ ان کے نام خود اللہ تعالیٰ کا پیغام لائی ہے۔ سلطان نے شاہی آداب کے مطابق اس کا استقبال کیا اور اسے ایک معزز سفیر کی حیثیت سے عزت و توقیر دی۔ اس نے اور اس کے درباریوں نے اس نوجوان مبلغہ کا پیغام بڑی توجہ اور احترام کے ساتھ سنا۔ پھر جب وہ اپنا پیغام سنا چکی تو سب نے اس سے بیک زبان کہا کہ ہمارا تو ان باتوں پر پہلے سے ہی ایمان ہے۔ سلطان نے اس خاتون کو اپنے ملک میں قیام کی دعوت دی۔ ساتھ ہی کہا کہ اگر ہماری یہ دعوت منظور نہیں تو ہم آپ کو ایک سفیر کے شایانِ شان تحفے تحائف اور محافظ دستے کے ساتھ آپ کے ملک واپس بھیج دیتے ہیں۔ اس خاتون نے یہ دونوں پیش کشیں منظور نہ کیں اور جس طرح تن تنہا وہاں پہنچی تھی اسی طرح تن تنہا واپسی کے سفر پر ہولی اور بڑے آرام و امن سے قسطنطنیہ جا پہنچی وہاں سے وہ برطانیہ جانے والے جہاز پر سوار ہوگئی۔ یہ بات انتہائی حیرت ناک دکھائی دیتی ہے کہ جب اہلِ یورپ نے اپنے مذہبی قوانین سے انحراف کرنا شروع کیا تو انھیں رواداری کی دولت نصیب ہوگئی اور جب مسلمانوں نے اپنے مذہب سے بے اعتنائی برتنی شروع کی تو ان میں رواداری جیسی خوبی کمزور پڑنی شروع ہوگئی اور ایک عظیم الشان تہذیب کے انحطاط کی علامات نمودار ہونے لگیں۔ میں نے جو واقعہ بیان کیا ہے اس میں عیسائیوں اور مسلمانوں کے عمل کے اختلاف کی وجہ اخلاق و کردار نہیں بلکہ

مذہب ہے۔ بے شک پہلے زمانے میں بھی شاذونادر مہذب اور نیک لوگوں میں رواداری جیسی خصوصیت موجود تھی لیکن وہ لوگ مروجہ مذہب سے بے اعتنائی برتنے والے ہوتے تھے۔ رواداری کو مذہب کا فقدان نہیں تو لا مذہب ضرور سمجھا جاتا تھا۔ ظہورِ اسلام سے پہلے بنی نوع انسان کے سامنے رواداری کی مذہب کے ایک اہم جزو کی حیثیت سے کبھی ہدایت و تلقین نہ کی گئی تھی۔ مسلمانوں کے لیے یہودیت' عیسائیت اور اسلام ایک ہی مذہب کی تین صورتیں ہیں اور یہ مذہب اپنی حقیقی صورت میں دینِ ابراہیمی یا اسلام یعنی رضائے الٰہی کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دینا ہے۔ یہی حکومتِ الٰہیہ کی بنیاد ہے۔

یہودیوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی لاڈلی قوم قرار دیتے ہوئے اس کی بخشش کو اپنی قوم کے لیے ہی مخصوص کر لیا اور خدا کی بادشاہت کو اپنی نسل کی میراث قرار دے دیا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بہت سے ارشادات سے' مثلاً جب ان سے پوچھا گیا کہ بچوں سے روٹی چھین کر کتوں کے سامنے ڈال دینا مناسب ہے یا جب انھوں نے فرمایا کہ وہ بنی اسرائیل کی گم شدہ بھیڑوں کے لیے بھیجے گئے ہیں' معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مشن صرف عبرانیوں کے لیے تھا' سینٹ پیٹر کے ایک خاص خواب کے بعد عیسائیوں نے اپنے آپ کو امراء میں انجیل مقدس کی تبلیغ کا مجاز سمجھا۔

عیسائیوں نے اللہ تعالیٰ کی رحمت و لطافت کو ان لوگوں تک ہی محدود سمجھا جو خاص اعتقادات پر ایمان رکھتے تھے۔ انھوں نے اس زمین پر خدا کی بادشاہت کو صرف راسخ العقیدہ عیسائیوں ہی کے لیے مخصوص سمجھا۔ ہر وہ شخص جو عیسائیت کی تعلیم پر ایمان نہ رکھتا تھا۔ ایک ناپاک آدمی سمجھا جاتا تھا یا اسے ایک ایسا مجرم سمجھا جاتا تھا جسے اپنی روح کی طہارت و صفائی کے لیے اپنے آپ کو بڑی سخت قسم کی جسمانی تکلیفوں اور عذابوں میں مبتلا رکھنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کی حقیقی بادشاہت کی تصویر تو صرف آئینۂ اسلام ہی میں نظر آ سکتی ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالنَّصَارَىٰ وَالصَّابِئِينَ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ج وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝ (البقرہ ۲:۶۱-۶۲)

یقین جانو کہ نبیؐ عربی کو ماننے والے ہوں یا یہودی، عیسائی ہوں یا صابی، جو بھی اللہ اور روزِ آخر پر ایمان لائے گا اور نیک عمل کرے گا اس کا اجر اس کے رب کے پاس ہے اور اس کے لیے کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں ہے۔

وَقَالُوا لَنْ يَدْخُلَ الْجَنَّةَ إِلَّا مَنْ كَانَ هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ ط تِلْكَ أَمَانِيُّهُمْ ط قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ۝ بَلَىٰ ق مَنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلَّهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهُ أَجْرُهُ عِنْدَ رَبِّهِ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝ (البقرہ ۲:۱۱۱-۱۱۲)

ان کا کہنا ہے کہ کوئی شخص جنت میں نہ جائے گا جب تک وہ یہودی نہ ہو یا (عیسائیوں کے خیال کے مطابق) عیسائی نہ ہو۔ یہ ان کی تمنائیں ہیں۔ ان سے کہو، اپنی دلیل پیش کرو اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو۔ دراصل نہ تمہاری کوئی خصوصیت ہے نہ کسی اور کی۔ حق یہ ہے کہ جو بھی اپنی ہستی کو اللہ کی اطاعت میں سونپ دے اور عملاً نیک روش پر چلے اس کے لیے اس کے رب کے پاس اس کا اجر ہے اور ایسے لوگوں کے لیے کسی خوف یا رنج کا کوئی موقع نہیں۔

وَقَالُوا كُونُوا هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ تَهْتَدُوا ط قُلْ بَلْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا ط وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۝ قُولُوا آمَنَّا بِاللَّهِ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْنَا وَمَا أُنْزِلَ إِلَىٰ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطِ وَمَا أُوتِيَ مُوسَىٰ وَعِيسَىٰ وَمَا أُوتِيَ النَّبِيُّونَ مِنْ رَبِّهِمْ ج لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِنْهُمْ ز وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ ۝ فَإِنْ آمَنُوا بِمِثْلِ مَا آمَنْتُمْ بِهِ فَقَدِ اهْتَدَوْا ج وَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا هُمْ فِي شِقَاقٍ ج فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللَّهُ ج وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ط

(البقرہ ۲:۱۳۴-۱۳۷)

یہودی کہتے ہیں' یہودی ہو تو راہِ راست پاؤ گے۔ عیسائی کہتے ہیں عیسائی ہو تو ہدایت ملے گی۔ ان سے کہو نہیں بلکہ سب کو چھوڑ کر ابراہیمؑ کا طریقہ اور ابراہیمؑ مشرکوں میں سے نہ تھا۔ مسلمانو! کہو کہ ہم ایمان لائے اللہ پر اور اس ہدایت پر جو ہماری طرف نازل ہوئی ہے اور جو ابراہیمؑ، اسماعیلؑ، اسحاقؑ یعقوبؑ اور اولادِ یعقوبؑ کی طرف نازل ہوئی تھی اور جو موسیٰؑ اور عیسیٰؑ اور دوسرے تمام پیغمبروں کو ان کے رب کی طرف سے دی گئی تھی۔ ہم ان کے درمیان کوئی تفریق نہیں کرتے اور ہم اللہ کے مسلم ہیں۔ پھر اگر وہ اسی طرح ایمان لے آئیں جس طرح تم لائے ہو تو ہدایت پر ہیں اور اگر اس سے منہ پھیریں تو کھلی بات ہے کہ وہ ہٹ دھرمی میں پڑ گئے ہیں۔ لہٰذا اطمینان رکھو کہ ان کے مقابلے میں اللہ تمہاری ہدایت کے لیے کافی ہے۔ وہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ۚ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ۭ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ۭ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۚ وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَاۗءَ ۚ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ وَلَا يَـــُٔـوْدُهٗ حِفْظُهُمَا ۚ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ ۝ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۣ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ۤ لَا انْفِصَامَ لَهَا ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝ (البقرہ ۲:۲۵۵-۲۵۶)

اللہ' وہ زندہ جاوید ہستی' جو تمام کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے۔ اس کے سوا کوئی خدا نہیں۔ وہ نہ سوتا ہے نہ اسے اونگھ لگتی ہے۔ زمین اور آسمان میں جو کچھ ہے اسی کا ہے۔ کون ہے جو اس کی جناب میں اس کی اجازت کے بغیر سفارش کر سکے۔ جو کچھ بندوں کے سامنے ہے اسے بھی وہ جانتا ہے اور جو

کچھ ان سے اوجھل ہے اس سے بھی وہ واقف ہے اور اس کی معلومات میں
سے کوئی چیز ان کی گرفتِ ادراک میں نہیں آ سکتی۔ الا یہ کہ کسی چیز کا علم وہ
خود ہی ان کو دینا چاہے۔ اس کی حکومت آسمانوں اور زمین پر چھائی ہوئی ہے
اور ان کی نگہبانی اس کے لیے کوئی تھکا دینے والا کام نہیں۔ بس وہی ایک
بزرگ و برتر ذات ہے۔ دین کے معاملے میں کوئی زور زبردستی نہیں۔ صحیح
بات غلط خیالات سے الگ چھانٹ کر رکھ دی گئی ہے۔ اب جو کوئی طاغوت کا
انکار کر کے اللہ پر ایمان لے آیا اس نے ایک ایسا مضبوط سہارا تھام لیا جو کبھی
ٹوٹنے والا نہیں اور اللہ (جس کا اس نے سہارا لیا ہے) سب کچھ سننے اور
جاننے والا ہے۔

یہ آیات ایک دوسری کے معنوں کو مکمل کرتی ہیں۔ جہاں اللہ تعالیٰ کی کبریائی و
جبروت کا ایسا تصور موجود ہو وہاں مذہب میں کوئی زبردستی یا جبر نہیں ہو سکتا۔

انسان اطاعت یا سرکشی کا راستہ خود منتخب کرتا ہے۔ ان لوگوں کے لیے جو سرکشی
کرتے ہیں بجائے خود یہ سزا ہے کہ وہ سچائی اور حقیقت کی روشنی سے دور ہوتے چلے
جاتے ہیں۔ مسلمان عام طور پر اس امر سے صرفِ نظر کر جاتا ہے کہ اس قانون کا اطلاق
دوسروں کی طرح خود اس پر بھی ہوتا ہے۔ قوانینِ الٰہی سب پر لاگو ہیں۔ ان کی عالم
گیریت سے کسی کو مفر نہیں۔ آج کل مسلمانوں میں دوسرے لوگوں کے عقائد و آرا کے
معاملے میں جو عدم رواداری دیکھنے میں آ رہی ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مسلمانوں
نے اب قرآنی تعلیمات سے روگردانی کرنی شروع کر دی ہے اور ان کے دلوں سے
قرآن پاک کا اللہ تعالیٰ کی کریمیت اور جبروت کا پیش کردہ نقشہ محو ہو چکا ہے۔

غیر مسلم دُنیا یہ اعتراض کرے گی کہ مسلمانوں میں اب رواداری باقی نہیں رہی۔
اور وہ ہر اس شخص کو جو ان کا ہم نوا نہ ہو' کافر گردانتے ہیں۔ افسوس تو اس بات کا ہے کہ
اکثر مسلمان اس قسم کی زیادتی کی تاویل قرآن کریم سے یہ دیتے ہیں کہ اس میں کافروں
کا تذکرہ موجود ہے۔ اور کافروں کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ مسلمانوں کو ان سے کوئی

واسطہ نہ رکھنا چاہیے اور ان سے جنگ کرنی چاہیے۔ میں آپ حضرات کو ایک صبر آزما وضاحت کی تکلیف دینے کے باوجود میں اجازت چاہوں گا کہ ''کافر'' کی اصطلاح کا مفہوم بیان کروں۔

کافر، مشرک اور اہل کتاب

قرآن پاک میں اس لفظ کے دو مفہوم ہیں لیکن منشائے الٰہی پا لینے کے بعد ایک ہی مفہوم رہ جاتا ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ کافر کسی مذہب کا پیرو نہیں۔ کافر تو بنی نوع انسان کے لیے اللہ تعالیٰ کے کریمانہ مقصد و منشاء کا ہی مخالف اور تمام مذاہب کی سچائیوں کا منکر ہے۔ وہ تمام الہامی کتابوں کا انکار کرتا ہے۔ وہ ان تمام نبیوں کو جھٹلاتا ہے جنھیں مسلمان اطاعتِ الٰہی میں بلاتفریق و امتیاز اللہ کے پیغمبر مانتا ہے۔ سب سے پہلا کافر ابلیس تھا جس نے اپنے غرور و تکبر کی بنا پر انسان کا احترام نہ کرنے میں اللہ کی نافرمانی کی۔

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ ق وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ○ (البقرہ ۲:۳۴)

پھر جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کے سامنے جھک جاؤ تو سب جھک گئے مگر ابلیس نے انکار کیا۔ وہ اپنی بڑائی کے گھمنڈ میں پڑ گیا اور نافرمانوں میں شامل ہو گیا۔

قرآن پاک نے بار بار یہ دعویٰ کیا ہے کہ اس نے تمام ادیان کے سچے ہونے کی تصدیق کی ہے۔ پہلی کتابیں معدوم ہو چکی تھیں یا ان میں ردّ و بدل ہو چکا تھا۔ گذشتہ انبیاء کے بارے میں ایسے ایسے قصے کہانیاں اور روایات تراشی گئی تھیں کہ تاریخ میں ان کا وجود مشکوک دکھائی دینے لگا تھا۔ قرآن پاک میں ارشاد ہے:

یہ ایک ایسی کتاب ہے جس میں کوئی شک نہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ لو۔ وہ تو تم لوگوں کے درمیان رہتے بستے ہیں اور تم ہی میں ہدایت و تبلیغ کرتے ہیں۔

اگر قرآنِ پاک کا وجود نہ ہوتا اور اگر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث نہ ہوتے تو ان لوگوں پر جو نبیوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بنی نوع انسان کی ہدایت وتعلیم کے لیے مامور کیے جانے کو ایک خوش فہمی اور ضعیف الاعتقادی سمجھتے ہیں' گرفت کرنی مشکل تھی۔ پہلی الہامی کتابوں کی صداقتوں پر آج قرآن پاک اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی مہرِ تصدیق ثبت ہے۔ جو لوگ ایک نبی اور ایک نبوت کے قائل نہیں' درحقیقت وہ بنی نوع انسان کے ہدایت الٰہی کے وجود سے جو تمام الہامی مذاہب کی ایک بنیادی حقیقت ہے' منکر ہیں۔

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَإِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللّٰهِ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ○ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكٰلَ فَإِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ ○

(البقرہ ۲: ۹۷-۹۸)

ان سے کہو جو کوئی جبریلؑ سے عداوت رکھتا ہے اسے معلوم ہونا چاہیے کہ جبریلؑ نے اللہ ہی کے اذن سے یہ قرآن تمھارے قلب پر نازل کیا ہے جو پہلے آئی ہوئی کتابوں کی تصدیق کرتا ہے اور ایمان لانے والوں کے لیے ہدایت اور کامیابی کی بشارت بن کر آیا ہے۔ (اگر جبریلؑ سے ان کی عداوت کا سبب یہی ہے تو کہہ دو کہ) جو اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کے رسولوں اور جبریلؑ اور میکائیل کے دشمن ہیں' اللہ ان کافروں کا دشمن ہے۔

قرآن کی ان آیات میں' جن میں جنگ کا تذکرہ ہے کافر سے مراد ایسے لوگ ہیں جو مسلمانوں سے برسرِ پیکار ہیں۔ 'کافر' کا اطلاق ہر بت پرست اور ہر غیر مسلم پر نہیں ہوتا جیسا کہ امان کے اس اعلان سے ظاہر ہے جو ان بدعہدی کرنے والے قبائل سے متعلق ہے جنھوں نے مسلمانوں سے معاہدات کرنے کے بعد انھیں مسلسل توڑا اور مسلمانوں پر حملہ آور ہوئے۔

بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ إِلَى الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ○ فَسِيْحُوْا

فِى الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّاعْلَمُوْا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِى اللّٰهِ لا وَاَنَّ اللّٰهَ مُخْزِى الْكٰفِرِيْنَ ○ وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ اَنَّ اللّٰهَ بَرِىْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ○ وَرَسُوْلُهٗ ط فَاِنْ تُبْتُمْ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ج وَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِى اللّٰهِ ط وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ○ اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ شَيْئًا وَّلَمْ يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ اَحَدًا فَاَتِمُّوْٓا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ ط اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ○ (التوبہ ۹: ۱-۴)

اعلان برأت ہے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے ان مشرکین کو جن سے تم نے معاہدے کیے تھے۔ پس تم لوگ ملک میں چار مہینے اور چل پھر لو پھر جان رکھو کہ تم اللہ کو عاجز کرنے والے نہیں ہو۔ اور یہ کہ اللہ منکرین حق کو رسوا کرنے والا ہے۔ اطلاعِ عام ہے اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف سے حج اکبر کے دن تمام لوگوں کے لیے کہ اللہ مشرکین سے بری الذمہ ہے اور اس کا رسولؐ بھی۔ اب اگر تم لوگ توبہ کر لو تو تمھارے ہی لیے بہتر ہے اور جو منہ پھیرتے ہو تو خوب سمجھ لو کہ تم اللہ کو عاجز کرنے والے نہیں ہو۔ اور اے نبیؐ انکار کرنے والوں کو سخت عذاب کی خوشخبری سنا دو۔ بجز ان مشرکین کے جن سے تم نے معاہدے کیے پھر انھوں نے اپنے عہد کو پورا کرنے میں تمھارے ساتھ کوئی کمی نہ کی۔ نہ تمھارے خلاف کسی کی مدد کی تو ایسے لوگوں کے ساتھ تم بھی مدتِ معاہدہ تک وفا کرو کیونکہ اللہ متقیوں کو پسند کرتا ہے۔

کافروں اور مشرکوں میں واضح فرق بتایا گیا ہے۔ مشرکین سے مراد وہ لوگ ہیں جو اللہ کے ساتھ کسی دوسرے کو شریک ٹھہرائیں۔ وہ بت پرست جنھوں نے مسلمانوں سے اپنے وعدوں اور معاہدات کو پورا کیا' کافروں میں سے نہ تھے۔ رسولؐ خدا نے خود ارشاد فرمایا کہ جو شخص مسلمان کو سلام کرے اسے کافر مت کہو۔ قرآنِ پاک کی اصطلاح میں دانستاً اور ارادتاً برائی کرنے والے لوگ ہی کافر ہیں۔ خواہ ان کا تعلق کسی بھی نسل'

عقیدہ اور قوم سے کیوں نہ ہو۔

میں نے اس وضاحت کو اس لیے ضروری سمجھا ہے کہ قرآنِ پاک اور سیرتِ نبویؐ سے اچھی طرح واقفیت نہ ہونے کی وجہ سے مسلمان اس مسئلے کے بارے میں اُلجھنوں کا شکار ہیں۔

بیشتر مسلمان اس بات کو کلی طور پر فراموش کر دیتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حلیفوں میں عرب میں اسلام کے غلبہ کے بعد بھی بہت سے بت پرست تھے اور ان کے ساتھ آپؐ نے اپنے معاہدات کو زبانی اور عملی طور پر پورا کیا۔ اپنے معاہدات کی میعاد ختم ہونے سے پہلے ان بت پرستوں کا اسلام قبول کر لینا مسلمانوں کی تلواروں کا مرہونِ منت نہ تھا بلکہ ان کے تقویٰ اور پاکیزگیٔ کردار و عمل کا نتیجہ تھا۔ عرب کے بت پرستوں پر فتح اور ان کے دائرۂ اسلام میں داخل ہو جانے کی داستان بہت سادہ ہے۔

ان بت پرستوں کے پاس اسلامی تعلیمات کے مقابلے میں پیش کرنے کے لیے سوائے توہمات کے اور کچھ نہ تھا۔ وہ جنگ میں فتح کے لیے اپنے دیوی دیوتاؤں کے سامنے سجدہ ریز ہوتے اور ان سے نصرت و حمایت کے طلب گار ہوتے تھے۔ انھیں اپنی افرادی قوت پر بھی بڑا تکبر تھا۔ ابتدا میں اس لحاظ سے ان کا پلہ ضرور بھاری رہا۔ لیکن جب مسلمانوں کو اس پر بھی ان پر فتح حاصل ہوئی تو وہ بے حد مایوس ہوئے اور ان کے دیوی دیوتاؤں کی طاقت و برتری کی کہانیاں سب مٹی میں مل گئیں۔ ایسی صورت میں یہ لازم تھا کہ وہ راہِ ہدایت پا جاتے۔ چنانچہ یکے بعد دیگرے یہ سب سرکش قبائل دائرۂ اسلام میں داخل ہوتے گئے۔

اہل کتاب، جن سے مراد وہ لوگ تھے جن میں انبیاء علیہ السلام مبعوث ہوئے تھے مثلاً یہودی، عیسائی اور زرتشتی، ان سے مسلمانوں کو سب سے پہلے واسطہ پڑا۔ ان سب کی طرف آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا رویہ حلم و بردباری کا تھا۔ آپؐ نے سینا کے عیسائی راہبوں کو جس منشورِ خسروی سے سرفراز فرمایا وہ آج بھی موجود ہے۔ اس منشورِ نبویؐ کے ہر لفظ سے نیک نیتی اور خیر خواہی کے جذبات ہی نہیں بلکہ محبت و لطف و کرم کی

جھلک بھی واضح طور پر دکھائی دیتی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کے یہودیوں کے ساتھ، جب تک وہ اپنے معاہدات پر کاربند رہے، مسلمانوں جیسا ہی سلوک کیا۔ آپؐ نے کسی شخص یا جماعت پر کوئی جبر یا سختی نہیں کی اور نہ ہی اختلاف عقائد کی وجہ سے کسی کو اذیت یا دُکھ پہنچایا۔ نہ کسی جماعت پر حملہ کیا۔ افراد و قوم کے ساتھ جو کچھ بھی سلوک کیا گیا ان کے اعمال ہی کی بنا پر کیا گیا۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عیسائی اور زرتشتی وفود کا جس طرح استقبال کیا اور ان کی عزت و تکریم کی، اس کی تفصیل آج بھی تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہے۔ ان باتوں میں تعصب اور مذہبی عدم رواداری کا کہیں بھی شائبہ نہ تھا۔

مسلمانوں کو یہ حقیقت، جسے وہ اکثر فراموش کر دیتے ہیں، ہمیشہ یاد رکھنی چاہیے۔ ہمارے نظریہ کے لیے یہ امر بھی نہایت اہم ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل کتاب کو اپنا پیرو بن جانے کی کبھی دعوت نہیں دی۔ بلکہ ان سے صرف یہ ارشاد فرمایا کہ وہ اللہ کی بادشاہت کو تسلیم کر لیں۔ خدا اور بندوں کے درمیان مذہبی راہنماؤں کی جو جماعت پیدا ہو گئی ہے اسے ختم کر دیں۔ اپنے مذاہب کی حقیقی تعلیمات کا احیاء کریں۔ اصل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہر شخص سے دریافت فرماتے تھے کہ کیا تم اللہ کی اس بادشاہت کے طلب گار ہو جس میں روئے زمین کے تمام انسان شامل ہیں یا تم ان سب انسانوں سے الگ ہو کر صرف اپنی ہی قوم کے طرف دار ہو۔ بلاشک یہ سب سے پہلا عقیدہ امن و امان اور انسانی ترقی کا طریقہ ہے۔ اور دوسرا جنگ و جدل، ظلم و تعدی اور معصیت کا راستہ ہے۔ دُنیا کے ان فرمانرواؤں نے، جن کے پاس آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوتِ اسلام پہنچی، اسے ایک مذہبی جنونی اور مغرور و گستاخ نودولتیئے کا پیغام سمجھا۔ (العیاذ باللہ!) آپؐ کے سفیروں سے برا سلوک کیا گیا انھیں تکالیف پہنچائی گئیں حتیٰ کہ ان میں سے بعض کو قتل بھی کر دیا گیا۔ ان فرمانرواؤں کی شقاوت و بدبختی اور پیغام نبویؐ کی صداقت پر غور فرمائیے۔ اگر آج فرمانروایانِ عالم کے پاس جب تمام اہلِ بصیرت پیغمبر اسلام کے مقدمات کے سامنے سرِ تسلیم خم کر چکے ہیں۔ جب دُنیا نے

خاصی حد تک مذہبی راہنماؤں یعنی پادریوں اور پروہتوں سے چھٹکارا حاصل کر لیا ہے اور آج انسانی بھائی چارے کی حقیقت اور اہمیت کا احساس وسیع تر ہوتا چلا جا رہا ہے' ایسا ہی ایک وفد پہنچے تو اس کا استقبال کتنا مختلف ہوگا۔

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۭ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ○ (آل عمران ۳:۶۴)

کہہ دیجیے اے اہل کتاب! اس بات کی طرف آؤ جو ہمارے اور تمھارے درمیان یکساں ہے کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور نہ اس کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرائیں اور نہ ہم میں سے کوئی کسی کو اللہ کے سوا رب بنائے اور اگر وہ پھر جائیں تو تم کہو گواہ رہو کہ ہم فرمانبردار ہیں۔

اگر وہ اہل کتاب جن سے اس طرح کی درخواست کی گئی تھی اس تجویز کو تسلیم کر لیتے تو ان کا شمار بھی مسلموں میں ہوتا۔ پیغمبرؐ خدا کا مقصد اپنے لیے کوئی مال و دولت' جاہ وحشمت یا قوت وسلطنت حاصل کرنا نہیں تھا۔ آپؐ کا واحد منشا تو اقوامِ عالم تک پیغامِ الٰہی پہنچانا تھا۔ موحد عیسائی اور ایسے یہودی قبائل جو اپنے ربّیوں کے توہمات سے آزاد اور اپنے کاہنوں کے چنگل سے رہائی پا لیتے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نظروں میں مسلمانوں ہی جیسی جماعت سمجھے جاتے۔ اگرچہ عیسائیوں' یہودیوں اور زرتشتیوں نے آپؐ کے پیغام کی قدر نہ کی اور ان کے بادشاہوں نے آپؐ کے قاصدوں کے ساتھ اہانت آمیز اور ظالمانہ سلوک کیا۔ پھر بھی آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ رحمت نے ان قوموں کی طرف اپنا رویہ ہمیشہ مخلصانہ و مربیانہ رکھا۔ سینا کے راہبوں کے لیے جو منشورِ خسروی جاری ہوا اس پر شاہد ہے۔ بلاشک بعد کے مسلمانوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معیارِ رواداری پر قائم نہ رہتے ہوئے بلکہ اکثر اوقات اس سے منحرف ہوتے ہوئے دوسرے مذاہب کے پیروکاروں کے ساتھ متکبرانہ رویہ روا رکھا ہے۔ لیکن اس پر بھی انھوں نے بحیثیتِ مجموعی یہودیوں اور عیسائیوں کے ساتھ حسن سلوک ہی برتا

ہے۔ اور حق تو یہ ہے کہ ان لوگوں سے حسنِ سلوک خود شریعتِ اسلامی کا تقاضا ہے۔

تاریخی شہادت

مسلمانوں کی فتوحاتِ مصر کے زمانے میں قبطیوں اور مسلمانوں کے تعلقات میں جو گرم جوشی خلوص اور وضع داری پائی جاتی تھی آج صدیاں گزرنے کے بعد بھی اسی طرح برقرار ہے۔ شامی عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان جو دوستانہ تعلقات پیدا ہوئے آج بھی اسی طرح قائم چلے آ رہے ہیں۔ شامی عیسائیوں نے تو اعلانیہ طور پر غیروں کی حکومت پر مسلمانوں کی حکومت کو ترجیح دی ہے۔ یہودیوں کی چھوٹی چھوٹی خوش حال بستیاں ہسپانیہ' شمالی افریقہ' شام' عراق اور بعد میں ترکی میں بھی بلکہ تمام دنیائے اسلام میں موجود تھیں۔ جب عیسائی دُنیا میں یہودیوں کی ہلاکت و تباہی کا بازار گرم تھا' عالم اسلام ہی ان کے لیے ایک گوشہ عافیت تھا۔ ایک معزز ربّی کی تقلید میں' جسے وہ مسیح موعود کہتے تھے' یہودی برضا و رغبت جوق در جوق حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔ لیکن ان کی بڑی تعداد اپنے آبائی دین سے وابستہ رہی۔ مسلمانوں نے ان کو امان دی اور وہ اس ظلم و ستم کو بھول گئے جو ان پر عیسائی دُنیا میں کیے گئے تھے۔ ترکی میں جو یہودی آباد ہیں وہ مسلمانوں کے ساتھ انتہائی دوستانہ و برادرانہ تعلقات قائم رکھے ہوئے ہیں۔ یہ انتہائی تعجب اور حیرت کا مقام ہے کہ فلسطین کے عربی خواں یہودی جو ہسپانیہ اور پولینڈ سے فرار ہو کر آئے ہوئے یہودیوں کی نسل سے ہیں فلسطین کے عیسائیوں اور مسلمانوں کے ساتھ فلسطین میں یہودیوں کے قومی وطن کے قیام کے مخالف ہیں۔

مسلمانوں اور عیسائیوں کے تعلقات کی وضاحت کے لیے میں حضرت عمرؓ بن خطاب خلیفہ ثانی کے یروشلم میں فاتحانہ آمد کی داستان' جو بہ کثرت بیان کی جاتی ہے' ضرور دہراؤں گا۔ کیونکہ اس سے اہل کتاب کے ساتھ مسلمانوں کے رویہ پر روشنی پڑتی ہے۔ مسلمان سپہ سالار فاتح یروشلم نے امیرالمومنین کی خدمت میں درخواست کی کہ وہ وہاں تشریف لا کر اس شہرِ مقدس کی کنجیاں وصول فرمائیں۔ خلیفۃ المسلمین سیدنا عمر فاروقؓ مدینہ سے اس شان سے روانہ ہوئے کہ ان کے ہمراہ صرف ایک غلام اور ایک اُونٹ

تھا۔ اس اُونٹ پر آقا اور غلام باری باری سوار ہوتے تھے۔ روما کے لوگوں نے اپنے بادشاہوں کی شان وشوکت وطمطراق کا نظارہ دیکھ رکھا تھا۔ انھوں نے جب عالمِ اسلام کے اس فقیر بادشاہ کو اس شان سے آتے دیکھا تو وہ فرطِ تحیر سے مبہوت سے رہ گئے۔ وہاں کے عیسائی خلیفۂ اسلام کو اپنے شہر کے عجوبۂ روزگار مشہور گرجا میں لے گئے۔ خلیفہ ابھی گرجا ہی میں تشریف فرما تھے کہ نمازِ عصر کا وقت ہو گیا۔ عیسائی عہدہ داروں نے اصرار کیا کہ وہ وہیں گرجا میں جائے نماز بچھا کر نماز ادا کر لیں لیکن خلیفہ نے یہ کہتے ہوئے گرجا میں نماز ادا کرنے سے انکار کر دیا کہ ایسا کرنے سے اس بات کا ڈر ہو سکتا ہے کہ ناسمجھ مسلمان بعد میں اس گرجا کو یہ کہہ کر مسجد میں تبدیل کر دیں کہ یہاں خلیفۂ اسلام نے نماز ادا کی تھی۔ انھوں نے اپنا جائے نماز گرجا کے باہر سیڑھیوں پر بچھایا اور نماز ادا کی۔ اس جگہ آج مسجدِ عمرؓ واقع ہے۔ سیاح قبۃ الصخریٰ کو مسجدِ عمرؓ کہتے ہیں۔ وہ مسجدِ عمرؓ نہیں بلکہ وہ تو مسجدِ اقصیٰ کے احاطے کے اندر یروشلم کا ہیکل ہے جو اسلام کا دوسرا مقدس شہر ہے۔ اس دن سے آج تک یہ گرجا عیسائیوں کی عبادت گاہ ہے۔ مسلمانوں نے اس گرجا کے استعمال پر اتنی پابندی ضرور عائد کر رکھی ہے کہ عیسائیوں کے ہر فرقے کے لیے اس کے دروازے کھلے رہیں اور کسی ایک فرقہ کو دوسروں کے لیے ممانعت اور اپنے لیے عبادت کا مخصوص حق حاصل نہ ہو۔

بیت اللحم میں بڑے گرجے اور دوسری مقدس عبادت گاہوں میں بھی ایسا ہی انتظام وانصرام ہے۔

اہل کتاب کے ساتھ عباسی خلیفہ ہارون الرشید اور اس زمانے تک جب مسلمان ہسپانیہ پر حکمران تھے یہ سلوک قائم رہا۔ اُس زمانے میں مسلمانوں اور عیسائیوں کے لیے کسی ایک جگہ کو مشترکہ عبادت گاہ کے طور پر استعمال کرنے کا رواج عام تھا۔ شام میں میں اب بھی درجنوں ایسی عمارات کی نشان دہی کر سکتا ہوں جو مشترکہ عبادت گاہوں کے طور پر استعمال ہوا کرتی تھیں۔ میں نے شیرون کے میدان میں لُد کے مقام پر سینٹ جارج کا ایک ایسا گرجا دیکھا ہے جس کی چھت ایک مسجد کی چھت کے ساتھ جڑی ہوئی

ہے اس گرجا اور مسجد کے درمیان ایک دیوار ہی حائل ہے۔ بلاشبہ ایسا ضرور ہوا ہے کہ کہیں کہیں ناسمجھ مسلمانوں نے محض اس بنا پر کہ وہاں مسلمانوں نے نماز پڑھی ہے پورے گرجا کو ہی اپنے تصرف میں لانا چاہا ہے۔ لیکن عموماً مسلمانوں کے زیر سایہ عیسائیوں کو مکمل مذہبی آزادی حاصل تھی۔ ان کے گرجا محفوظ تھے۔ وہ نئے گرجا تعمیر کر سکتے تھے۔ البتہ ایک نئے فرمان کے تحت تمام گرجاؤں سے گھنٹے اُتروا دیے گئے تھے کیونکہ کہا جاتا تھا کہ ان کے انتہائی شور سے مسلمانوں کو تکلیف ہوتی تھی۔ صرف یروشلم کے مقدس گرجا کا گھنٹہ رہنے دیا گیا تھا۔ عیسائیوں کو عبادت کے لیے ناقوس بجانے کی اجازت تھی جیسا کہ حضرت نوح علیہ السلام نے مسلمانوں کو اپنی کشتی میں بلانے کے لیے ناقوس استعمال کیا تھا۔ عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان عہدِ اوّل کی مساوات کو مسلمانوں کے غرور و تکبر نے نقصان ضرور پہنچایا لیکن یہ صلیبی محاربات کے بعد کی بات ہے۔

مسلمانوں نے عیسائیوں پر کبھی کوئی زبردستی یا جبر نہیں کیا۔ بلکہ ان سے ہمیشہ شریفانہ اور رحم دلانہ سلوک روا رکھا۔ تاریخِ اسلام کے ایک نہایت مختصر سے زمانے میں مسلمانوں نے اس سے انحراف ضرور کیا۔ مصر کے فاطمی حکمرانوں نے جب شام کو اپنے زیرِ نگین کر لیا تو خلیفہ حاکم بامراللہ نے، جس کی دُروز آج بھی پرتو الٰہ سمجھ کر پوجا کرتے ہیں، ان پر ظلم و ستم کا دروازہ کھول دیا۔ سیکڑوں عیسائی راہبوں کا جو یہودیہ کے پہاڑوں اور غاروں میں رہتے تھے قتل عام کر کے ان کا مثلہ کیا گیا۔ اگرچہ مقامی مسلمانوں کی سفارش پر بہت سے راہب بچ گئے۔ لیکن عیسائی مسلمانوں کے سب و شتم کا ہدف ضرور بنے۔ ان کے گرجاؤں میں زائرین کا داخلہ بند کر دیا گیا۔ لیکن یہ پابندی تھوڑی ہی مدت تک برقرار رہی۔

یورپی زائرین نے اس مذہبی عدم رواداری کی داستانوں کو خوب حاشیے چڑھا کر اور مزے لے لے کر یورپ میں پھیلا۔ یوں صلیبی محاربات کی راہ ہموار کی۔ جس وقت صلیبی افواج شام تک پہنچیں۔ اس وقت بنو فاطمہ کا شام سے اخراج عمل میں آچکا تھا اور

عیسائیوں کو پہلے جیسی آزادی اور امن وچین حاصل ہو چکا تھا۔

شامی عیسائی ہرگز صلیبی جنگوں کے خواہاں نہیں تھے۔ لیکن عیسائی جنگ بازوں کو ان کے جذبات کی مطلق پرواہ نہ تھی۔ وہ تو انھیں بے دین' مرتد اور گمراہ سمجھتے تھے۔ یہ حیرت ناک باتیں کہی جاسکتی ہیں لیکن ان کی ایک خاص تاریخی وجہ ہے۔

مشہور عباسی خلیفہ ہارون الرشید نے ایک مرتبہ (خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ کیوں) دوسرے تحائف کے ساتھ بیت المقدس کے مشہور گرجے کی کنجیاں فرانس کے بادشاہ شارلیمان کو بھیج دیں۔ تاریخی اعتبار سے یہ شامی عیسائیوں کے ساتھ' جو مغربی کلیسا کے حامی نہ تھے اور اسلامی حکومت کے سوا کسی سے تحفظ کے خواہاں نہ تھے' شدید بے انصافی اور ظلم تھا۔ یہ غلطی سیاسی طور پر بھی اسلامی حکومت کے لیے ایک عذاب بن گئی۔ یہ سچ ہے کہ کنجیوں کے دو جوڑے تھے۔ گرجا روزانہ کھلتا تھا اور اس وقت تک برابر کھلتا رہا جب شارلیمان نے اسے کھولنے کی خاطر مقفّل نہ کرا دیا۔ کنجیوں کا تحفہ تو ایک لطیف اشارہ تھا کہ آپ اور آپ کے ساتھی اس گرجا میں جو آپ کے مذہب کا مرکز اور زیارت کا مقام ہے جب چاہیں بے کھٹکے تشریف لا سکتے ہیں۔ لیکن فرانسیسی عیسائیوں نے بعد میں اس تحفے کو کچھ اور ہی معنی پہنا دیے۔ انھوں نے اپنے آپ کو گرجا کا مالک اور شامی عیسائیوں کو راہبوں اور غاصبوں کا درجہ دینا شروع کر دیا۔ خلیفہ کی طرف سے عیسائی بادشاہ کو یہ تحفہ صدیوں بعد فرانس کے بڑے بڑے ناروا مطالبات کا سبب اور بالواسطہ روس کے بڑے اور سنگین مطالبات کی بنا ثابت ہوا کیونکہ روس رومن کیتھولک عیسائیوں کی ترکتازیوں کے خلاف مشرقی عیسائیوں کا محافظ بننا چاہتا تھا۔ روس کا یہی جذبہ اور اس کے مطالبات اس تمام آویزش ونزاع کا سبب ثابت ہوئے جو مسلمانوں اور ان کی عیسائی رعایا کے مابین پیدا ہوئی۔ جب صلیبی محاربات میں عیسائیوں نے یروشلم فتح کر لیا تو انھوں نے مسلمانوں کے ساتھ ہی مشرقی عیسائیوں کا بھی قتل عام کیا۔ وہ عیسائی جو شام میں رہ گئے اور مسلمانوں کی پسپا ہونے والی فوج کے ساتھ نہ گئے۔ انھیں نیچ اور گھٹیا سمجھا گیا۔ انھیں ان تمام امتیازات سے بھی محروم کر دیا گیا جو انھیں

اسلامی حکومت میں حاصل تھے۔ زندگی میں اپنے لیے اچھی حیثیت حاصل کرنے کے لیے ان میں بہت سے تو رومن کیتھولک بن گئے۔ لیکن جب مسلمانوں نے دوبارہ شام فتح کر لیا تو جو عیسائی وہاں سے ہجرت کر گئے تھے وہ شام واپس آ گئے۔ اس طرح ان مشرقی عیسائیوں کو پاپائے روم کے زیراثر عیسائیون پر عددی برتری حاصل ہو گئی۔ پرانا اسلامی نظم ونسق پھر بحال ہو گیا اور تمام ذمیوں کو شریعت کے عطا کردہ حقوق دوبارہ حاصل ہو گئے۔ لیکن بشری تقاضے کے سبب اس بدمزگی اور آویزش نے مسلمانوں کے جذبات میں ایک تلخی سی بھر دی اور ان کے دلوں میں عیسائیوں کے خلاف نفرت وحقارت کے جذبات بھی پیدا ہو گئے۔

یہ نئی صورت حال دونوں قوموں کے لیے افسوس ناک تھی۔ اس نے ایک طرف تو مسلمانوں کو معاشرتی طور پر عیسائیوں کے خلاف جابر وسخت گیر بنا دیا۔ دوسری طرف عیسائیوں کے خلاف مسلمانوں کے جذبۂ نفرت وحقارت کو اتنی دیر تک طوالت دی کہ مغرب دماغی ترقی اور تفوق میں ان کو شکست دے گیا اور مسلمان دیر تک اس ترقی کی طرف سے لاپروائی برتتے رہے۔ عیسائیوں کے خلاف مسلمانوں کا یہ غرور وتکبر رفتہ رفتہ راسخ ہو کر ان کی فطرت کا ایک حصہ بن گیا۔ خدیو مصر ابراہیم پاشا نے جب انیسویں صدی کے تیسرے عشرے میں شام پر قبضہ جمایا تو دمشق کے مسلمانوں کا ایک وفد اس کے پاس پہنچا۔ انھوں نے اس سے شکایت کی کہ عیسائیوں نے گھوڑے کی سواری شروع کر دی ہے۔ ابراہیم پاشا نے بظاہر بڑی پریشانی اور فکرمندی کا اظہار کیا اور کہا کہ وہ اس رات اس بھیانک صورت حال پر غور وخوض کرے گا۔ اگلی صبح اس نے اس وفد کے سامنے اعلان کیا کہ بے شک عیسائیوں کا گھڑسواری میں مسلمانوں کے ہم پلّہ ہونے کی جسارت کرنا انتہائی ذلّت آمیز بات ہے۔ اس لیے مسلمان ایسا کریں کہ گھڑسوار عیسائیوں سے بلند رہنے کے لیے اُونٹ کی سواری شروع کر دیں۔ اس موقع پر دمشق کے مسلمانوں کو اپنی شکایت کی نامعقولیت کا احساس ہوا۔

اٹھارہویں صدی عیسوی کے آغاز تک مسلمانوں نے اپنی ذمّی عیسائی رعایا پر

بعض معاشرتی پابندیاں لگا رکھی تھیں۔ لیکن وہ پابندیاں ان ظالمانہ پابندیوں کے سامنے کچھ نہ تھیں جو اسی زمانے میں عیسائی امراء نے اپنے رومن کیتھولک مزارعین پر عائد کر رکھی تھیں۔ یہ پابندیاں ان مظالم اور بے انصافیوں کے سامنے بھی کچھ نہ تھیں جو آئرلینڈ کے رومن کیتھولک پروٹسٹنٹ فرقہ والوں کے ساتھ روا رکھے ہوئے تھے۔ مسلمانوں کی عائد کردہ پابندیوں کا اثر صرف امیر آدمیوں پر تھا۔ غریب مسلمان اور غریب عیسائی تو اس وقت بھی باہم پرخلوص دوست اور ہمسائے تھے اور ان میں ہر قسم کی مساوات تھی۔ مسلمانوں نے عیسائی ذمیوں کی مذہبی آزادی میں کسی قسم کا دخل نہ دیا۔ مسلمان حکومتوں کے زیرسایہ عیسائیوں کے لیے مذہبی سزاؤں یا ''سمتھ لینڈ کی آگ'' کا کوئی قصہ نہ تھا اور نہ ہی مسلمانوں نے ان کے مذہبی فرقہ وارانہ جھگڑوں اور مناقشوں میں کوئی مداخلت کی۔ اس طرح عیسائیوں کے چھوٹے چھوٹے فرقے جنھیں بڑے اور بااقتدار فرقوں والے بے دین اور ملحد کہتے تھے اور جنھیں اگر ان بڑے اور مقتدر فرقوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جاتا تو ان کا نیست و نابود ہو جانا لازمی تھا' اسلام کے سایۂ عافیت میں آج تک آزاد اور محفوظ چلے آتے ہیں۔

اسلامی سلطنت میں ایک وقف

بے شمار عیسائی خانقاہیں جن کے خزانوں اور نوادرات کی مالیت کروڑوں پونڈ تک پہنچتی ہے' سینا کے راہبوں کے نام پیغمبرؐ اسلام کے عطا کردہ منشورِ آزادی کی بدولت مسلمانوں کے زیرسایہ قائم رہیں اور پھلتی پھولتی رہیں۔ مسلمان ان کا احترام کرتے رہے۔ عیسائیوں کے مختلف فرقوں کو سلطنت کی مجلس شوریٰ میں نیابت دی گئی۔ صوبہ دار اور ضلع دار مجالس میں ان کے پادریوں کو نیابت کا حق حاصل تھا۔ ایسے مسائل میں جن کا تعلق صرف عیسائیوں سے تھا ان کے نمایندوں کی رائے بلاپس و پیش تسلیم کی جاتی تھی۔

عیسائی خانقاہوں سے متعلق مسلمانوں کے احترام کا ایک عجیب و غریب واقعہ مجھے یاد ہے۔ ۱۹۰۸ء میں بیت المقدس کے بڑے گرجا سے یونانی گرجا کے عربی خواں یونانی عبادت گزاروں نے ملحقہ خانقاہ سینٹ جارج نامی کے راہبوں کے خلاف بغاوت

کر دی۔ اس خانقاہ کی بہت بڑی جاگیر تھی جس سے بے شمار آمدنی ہوتی تھی۔ اس آمدنی کا غالب حصہ ان جائیدادوں سے بھی وصول ہوتا تھا جو ان عربی بولنے والے یونانیوں کے آباؤاجداد نے بدامنی اور بدانتظامی کے ایک دور میں اس خانقاہ کے نام اس خیال سے کہ مسلمان مذہبی اداروں اور اوقاف کا احترام کرتے ہیں' اس شرط پر منتقل کر دی تھیں کہ اخراجات پورے کرنے کے بعد جو رقم بچ رہے وہ ان کی اولاد کو ان خانقاہوں سے ملتی رہے لیکن بعد میں راہبوں نے اس جائیداد پر ایسا قبضہ جمایا کہ سو سال تک ان مستحقین کو ایک پھوٹی کوڑی بھی نہ مل سکی۔ گرجا کے یہ عربی خواں یونانی عبادت گزار اب مطالبہ کرتے تھے کہ پوری ایک صدی کے اس ناجائز قبضے و خیانت سے کچھ نہ کچھ رقم کم از کم ان کے بچوں کی تعلیم ہی کے لیے وقف کر دی جائے۔ بطریق نے ان لوگوں کی حمایت و تائید کی۔ لیکن راہبوں نے اسے گرفتار کر کے قید کر دیا۔ ان عبادت گزاروں نے خانقاہوں پر حملہ کرنا چاہا تو ان پر ان دُنیا دار راہبوں نے تیزاب کی برسات کر دی۔ اس پر ان لوگوں نے حکومت ترکی سے رجوع کیا۔ حکومت کی مداخلت پر بطریق کو قید سے رہائی نصیب ہوئی اور یونانی عبادت گزاروں کو کچھ مراعات دی گئیں۔ لیکن ترکی حکومت راہبوں سے مدتوں کی نگلی ہوئی دولت نہ اُگلوا سکی۔ کیونکہ شریعت خانقاہوں کی آزادی اور خودمختاری کو تسلیم کرتی تھی۔ عیسائیوں کے دلوں میں جس بات نے زہر بھر دیا۔ وہ یہ تھی کہ جن عیسائیوں نے ایسے ہی حالات میں حفاظت کی غرض سے اپنی جائیدادیں یروشلم کی مسجد الاقصیٰ کی امانت میں دے دی تھیں وہاں سے انھیں برابر سالانہ آمدنی وصول ہوتی تھی۔

اس سلسلے میں ایک اور دلچسپ واقعہ بھی سن لیجیے:

سینٹ جارج کی خانقاہ کے ایک چھوٹے پادری نے خانقاہ کے خزائن میں سے مٹھی بھر جواہرات چوری کر لیے جن کی مالیت چالیس ہزار پونڈ کے لگ بھگ تھی۔ وہ ان جواہرات کو یورپ لے جا کر فروخت کرنا چاہتا تھا لیکن فرار ہوتے وقت وہ جافہ میں گرفتار کر لیا گیا۔ اسے یروشلم واپس لایا گیا۔ وہ بے چارہ ترک حاکم کے سامنے بلند

آواز میں روتا تھا اور گڑگڑاتا تھا کہ اس پر ترکی قانون کے تحت مقدمہ چلایا جائے۔ لیکن مسلمان حاکم کا کہنا تھا کہ عیسائی خانقاہوں پر اسلامی حکومت کا کوئی اختیار نہیں اور اس بدقسمت کو خانقاہ کے راہبوں کے حوالے کر دیا گیا۔ لیکن ترکوں کی مذہبی رواداری اور بے تعصبی کے واقعات کو جو ذمّیوں سے مراعات اور حسن سلوک کے ہوتے تھے' ان کے سیاسی مخالفین نے ان کے خلاف بعینہٖ اسی طرح استعمال کیا جس طرح ترکوں کی طرف سے دورِ عروج و اقتدار میں عطا کردہ مراعات کو ان کے عہدِ زوال و انحطاط میں حقوق اور امتیازات کے شان دار نام سے پکارا جانے لگا۔ مجھے اجازت دیجیے کہ مثال کے طور پر ایک ایسی ہی سیاسی رعایت کی تفصیل بیان کروں۔ تین سو سال قبل صرف فرانسسکن راہب ہی مغربی یورپ کے عیسائی مبلغین تھے۔ جب طاعون کی وبا پھوٹی اور شہروں کے شہر ماتم کدہ بن گئے تو ان پادریوں نے بلالحاظ مذہب و ملت بیماروں کی تیمارداری کی اور مردوں کی تجہیز و تکفین کا کام کیا۔ ان کی ان خدمات اور جذبہ خدمت خلق پر خوش ہو کر حکومت ترکی نے اعلان کر دیا کہ فرانسسکن درویشوں کا تمام مال اور جائیدادیں ٹیکسوں اور محصولات وغیرہ سے آزاد رہیں گی۔ شاہی اعلان میں لفظ فرنکشن (مغربی یورپی) درج تھا۔ بعد میں جب مغرب سے سیکڑوں عیسائی مبلغین وہاں پہنچ جن کی اکثریت رومن کیتھولک نہیں بلکہ دوسرے عیسائی فرقوں سے تعلق رکھتی تھی تو ان سب نے اس اعلان کی رُو سے اپنے لیے بھی یہی رعایت حکومتِ ترکی سے طلب کی۔ اس پر حکومتِ ترکی نے شاہی فرمان کے پیش نظر انھیں بھی یہ رعایت دے دی۔ لیکن ان لوگوں نے اس شاہی عطیہ کو اپنا ایک ایسا حق سمجھ کر طلب کیا جو انھیں کسی فاتح فوج کی تلوار سے یا کسی بین الاقوامی عہدنامے سے حاصل ہوا تھا۔ ان مبلغین نے اپنے ملک کے سفیروں سے مطالبہ کیا کہ وہ حکومت کی طرف سے ان کی سیاسی امداد کریں تاکہ انھیں اپنے حقوق سے محروم نہ ہونا پڑے۔

عیسائیوں کو یہ حق دیا گیا کہ وہ اپنی زبان اور روایات کا تحفظ کریں۔ انھیں اس کی اجازت دی گئی کہ وہ اپنے مدرسے قائم کریں۔ دوسرے ملکوں کے عیسائی مبلغین کو بھی ان

کے پاس آنے کی اجازت دی گئی۔ اس طرح مسلمانوں کے زیرِحفاظت ان کی عالم گیر برادری کے اندر قومیت کے چھوٹے چھوٹے گروہ پیدا ہو گئے۔ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں اسلام کی عالم گیر آغوشِ عافیت و رحمت میں اُس بے مثال رواداری نے پرورش پائی جس تک پہنچ کر انسان رنگ و نسل، قبیلہ و جماعت سے ماورا ہو جاتا ہے۔

شام، مصر اور میسوپوٹیمیا میں جہاں قومیت اور زبان دونوں کا اتحاد تھا نصب العین کی کوئی چپقلش پیدا نہ ہوئی۔ جہاں کہیں عیسائیوں اور مسلمانوں میں زبان کا اختلاف موجود تھا وہاں مطمعِ نظر میں بھی اختلاف پیدا ہوا۔ جب تک اسلامی سلطنت اپنے نظم و نسق، خوش حالی اور تعلیم و علم کے اعتبار سے عیسائی ممالک سے برتر رہی۔ جب تک عیسائیوں نے اپنے جذبۂ قومیت میں متعصبانہ گہرائی نہ پیدا کر لی۔ حاکم و محکوم کے مابین کوئی آویزش پیدا نہ ہوئی۔ مسلمانوں کا پلہ سترھویں صدی کے آغاز تک عیسائیوں کے مقابلے میں بھاری رہا۔ اس کے بعد تقریباً اسّی سال تک ترکی کی حکومت میں خرابیاں پیدا ہوتی رہیں اور عیسائیوں پر زیادتیاں شروع ہونے لگیں جن کی وجہ آئینِ اسلام کا عدم نفاذ تھا۔ پھر بھی گزشتہ نظم و نسق کی عمدگی اور ذمّیوں سے روادارانہ سلوک کا اثر اس حد تک موجود اور موثر تھا کہ روس کو اس اسلامی سلطنت کے عیسائی ذمّیوں میں منفی جذبۂ قومیت پیدا کرنے کے لیے ایک صدی سے زیادہ عرصہ تک مسلسل خفیہ پروپیگنڈا کرنا پڑا اور طویل کوشش کے باوجود روس کو اس وقت تک کامیابی نصیب نہ ہو سکی جب تک ترکی کی عیسائی رعایا میں ایک مذہبی جنون پیدا کر کے اسے نہ اُبھار لیا۔ اسّی برس کی بدنظمی کے بعد اصلاح کا وہ دور شروع ہوا جس میں اسلامی حکومت نے اپنی رعایا کے ہر طبقے کی فلاح و بہبود کے لیے کوششیں کرنی شروع کیں۔ لیکن اس وقت تک سربیوں، یونانیوں، بلغاروں اور رومانیوں کی واپسی کا زمانہ ختم ہو چکا تھا۔ روس کے مذہبی پروپیگنڈا کا زہر کارگر ثابت ہو چکا تھا اور ترکی پر روس کی فتوحات نے یونانی عیسائیوں کے گھٹیا اور پست طبقہ میں یہ امید پیدا کر دی تھی کہ انھیں جلد ہی مسلمانوں پر غلبہ حاصل ہو جائے گا جس کے لیے روس کے سفیروں، پادریوں اور راہبوں نے ان کے دلوں میں ایک اُمنگ اور تمنا پیدا کر

رکھی تھی۔

میں تاریخ کے اس دور سے تفصیلی مباحثہ نہیں کرنا چاہتا۔ اگرچہ مجھے اس کا مکمل علم حاصل ہے۔ یہ حال ہی کے واقعات ہیں اور مجھے خدشہ ہے کہ ان کا اعادہ حاضرین کے جذبات کو ضرور مشتعل کر دے گا۔ میں آپ کو صرف اتنا بتانا چاہتا ہوں کہ یونان کی جنگِ آزادی میں ۱۸۲۱ء میں نہ صرف موریا کی تین لاکھ کی مسلم آبادی کے مرد عورتیں' بچے اور بوڑھے سب ہی شہید کر دیے گئے بلکہ یونان کے شمالی علاقوں میں بھی مسلمانوں کا صفایا کر دیا گیا۔ لیکن حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ یورپی تاریخ میں اس قتل و غارت کا تذکرہ تک موجود نہیں البتہ ترکوں نے ان حملوں کے سدباب کے لیے جو کارروائیاں کیں انھیں خوب حاشیئے چڑھا کر بیان کیا گیا ہے۔ خوب یاد رکھیے کہ جب بھی مسلمانوں نے دورِ حاضرہ میں عیسائیوں پر یلغار کی ہے تو یہ عیسائیوں کے ہاتھوں مسلمانوں کے وسیع پیمانے کے قتل عام کا جواب تھا۔ یہ بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ مسلمانوں کے خون سے اپنی تلواریں رنگنے والے مسلمانوں کے قدیم دوست اور ہمسائے تھے۔ کسے نہیں معلوم کہ آرمینیا کے لوگ پچاس برس تک ترکوں کے لطف و کرم کے مزے لوٹتے رہے۔ یہ لوگ ترک حکومت سے بے حد ہی خوش تھے' جیسا کہ نام نہاد آزادی کے بعد ان کی ترکوں کے پاس واپسی کی متعدد کوششوں سے ظاہر ہوتا ہے۔

اسلامی سلطنت کے باہر کے عیسائیوں نے باقاعدگی اور تواتر کے ساتھ مسلمانوں کے خلاف انھیں مذہبی بنیادوں پر بھڑکایا اور اُکسایا۔ ان کے پادریوں نے انھیں بتایا کہ مسلمانوں کا قتل بڑے ثواب کا کام ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ترکی کی تباہی کی یہ سازش حد درجہ کمینگی اور رذالت کی شاندار مثال ہے۔ کیا انسانی ترقی کے خلاف' آسمانی راہنمائی اور نوعِ انسان کے مقصد کے خلاف اس سے بڑھ کر کوئی نمایاں بغاوت ذہن میں آسکتی ہے؟ عیسائیوں کی اس حد درجہ بری اور ناپاک کوششوں کا یہ نتیجہ ہے کہ مذہبی رواداری دُنیا والوں کی نظر میں ایک اچھائی نہیں بلکہ ایک برائی اور گناہ بن گئی ہے۔ کیونکہ لاکھوں عیسائی جو ترکی میں امن و آسائش کی زندگی بسر کر رہے تھے اس کے زوال کا سبب بنے۔

دوسری طرف مذہب کے نام پر تعزیر و تباہی کو جو عیسائی دُنیا میں عام رہی ہے ایک مناسب و محفوظ مسلک سمجھا گیا۔ مذہبی رواداری کو اس طرح سیاسی حماقت ثابت کیا جاتا ہے۔ لیکن درحقیقت ایسا نہیں ہے۔ اصل میں ظالم مظلوم سے زیادہ ہماری ہمدردی اور رحم کا حق دار ہے۔ ہسپانیہ کا زوال وہاں کے مسلمانوں کے اخراج کی تاریخ سے شروع ہوا۔ سان فرنانڈو و مفتوحہ علاقوں سیوائل، موریکا اور ٹولیڈو کے مفتوحین کے ساتھ اپنے جانشین کی نسبت روادارانہ سلوک کرنے میں اپنے ملک کا بہتر خیر خواہ تھا۔ اس کے جانشین نے تو غرناطہ پر قبضہ کرنے کے بعد وہاں کے مسلمانوں اور یہودیوں کو کڑی اور ظالمانہ سزائیں دیں گویا ان پر جہنم کے دروازے کھول دیے۔ موجودہ بلقانی ریاستیں اور یونان ایک لعنت کی پیداوار ہیں۔ کوئی تعجب نہیں کہ مغربی تہذیب کا زوال اس روز سے سمجھا جائے جس روز مہذب سیاست دانوں نے زار کے عہد کے روس کی ظالمانہ اور انسانیت سوز حکمت عملی پر اتفاق کر لیا اور روسی گرجا کے مذہبی جنون کو سراہا۔ بلاشک تاریخ کی نظر میں مذہبی رواداری، اقوام کی تہذیب و ثقافت کی روشن ترین دلیل ہے۔

کسی مسلمان کو یہ ہرگز زیبا نہیں کہ وہ ایک اسلامی سلطنت کی اُس بھیانک تباہی کو دیکھ کر، جو ان لوگوں کے ہاتھوں عمل میں آئی جنھیں مسلمانوں نے صدیوں اپنے ہاں پناہ دی اور ایسے زمانے میں بے حد امن و آرام سے رکھا جب مغربی یورپ میں دوسرے مذہبوں کے سب لوگوں کو ختم کر دینا یا اپنے مذہب میں داخل کر لینا ایک مقدس مذہبی فریضہ سمجھا جاتا تھا۔ کسی مسلمان کو ہرگز زیب نہیں دیتا کہ ان حالات کے پیش نظر رواداری کی اسلامی تعلیم کو اسلام کی کمزوری خیال کرے۔ رواداری اسلام کا زریں اصول اور بڑی قوت ہے۔ کیونکہ مسلکِ حق و صداقت یہی ہے۔ اللہ تعالیٰ اُسی طرح صرف یہودیوں، عیسائیوں اور مسلمانوں ہی کا معبود نہیں جس طرح اس کی بارانِ رحمت صرف عیسائیوں، یہودیوں اور مسلمانوں ہی کے لیے وقف نہیں۔ اس کے باوجود ہمیشہ کی طرح آج بھی بعض لوگ کہتے ہیں:

لن یدخل الجنۃ الا من کان ھودًا او نصارٰی ؕ

کوئی جنت میں داخل نہ ہوگا سوائے اس کے کہ وہ یہودی یا عیسائی ہو۔

ایسے لوگوں کو قرآنِ پاک کا یہ جواب سنا دیجیے:

بَلٰی مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗۤ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ (البقرہ ۲:۱۱۰-۱۱۲)

حق یہ ہے کہ جو بھی اپنی ہستی کو اللہ کی اطاعت میں سونپ دے اور عملاً نیک روش پر چلے اس کے لیے اس کے ربّ کے پاس اس کا اجر ہے اور ایسے لوگوں کے لیے کسی خوف یا رنج کا موقع نہیں۔

○○○

خطبۂ ششم

تقدیر پرستی

میں نے آپ لوگوں کے سامنے اسلام کی شان وشوکت سطوت و جبروت اور تنزل وزوال کی داستان پیش کی ہے۔ اسلام کے تنزل کو اس کی ایک جبلی کمزوری یعنی تقدیر پرستی پر قیاس کرنا آج کل فیشن بن گیا ہے۔ اگر واقعی ایسا ہی ہے تو اسلامی تہذیب کی شان وعظمت اور اس بلند مرتبہ کو جو مسلمانوں نے حاصل کیا اور جس پر وہ صدیوں تک فائز رہے' کس چیز پر قیاس کیا جائے گا؟ منطقی طور پر پھر بلاشبہ اسلام کی اسی تقدیر پرستی ہی کو اس کی عظمت و شان وشوکت کا سبب تسلیم کرنا پڑے گا۔ لیکن ایسا ناممکن ہے اگر ہم یہ تسلیم کر لیں کہ تقدیر پرستی اسلام کا ایک جبلی یا فطری عیب ہے تو اس سورج سے بھی زیادہ واضح حقیقت کی کیا توجیہہ پیش کی جائے گی کہ جب تک مسلمان اپنے مذہبی عقائد پر پوری طرح کاربند رہے تو وہ ہر جگہ کامیاب و کامران ہوتے رہے اور جب انھوں نے اپنے عقائد سے روگردانی شروع کی تو ان پر سستی اور کاہلی چھا گئی۔ وہ تن آسان اور سست الوجود بن گئے۔ ان پر انحطاط وتنزل مسلط ہوتا گیا۔ بلاشبہ تاریخ کے بعض زمانوں میں دنیائے عیسائیت کی طرح عالمِ اسلام میں بھی مسئلۂ جبر واختیار' ہنگاموں اور بدامنیوں کا سبب بن رہا ہے۔ قرآن پاک میں اختیار کی حدود پوری صراحت کے ساتھ متعین ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ و مطلقہ تو مسلّمہ ہے۔ اس میں انسان کو ایک حد تک اختیارات سے نوازا گیا ہے۔ لیکن اپنے حلقۂ اختیارات میں بھی انسان کو قانونِ

الٰہی کے تابع رہنا ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں ارشاد خداوندی ہے:

اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ فِيْ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ ؕ وَاِنْ تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِكَ ؕ قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ فَمَالِ هٰۤؤُلَآءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ حَدِيْثًا ؕ مَاۤ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ وَمَاۤ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ ؕ وَاَرْسَلْنٰكَ لِلنَّاسِ رَسُوْلًا ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ۝ (النساء ۴: ۷۸-۷۹)

رہی موت تو تم جہاں کہیں بھی ہو وہ بہرحال تمھیں آ کر رہے گی خواہ تم کیسی ہی مضبوط عمارتوں میں ہو۔ اگر انھیں کوئی فائدہ پہنچتا ہے تو کہتے ہیں یہ اللہ کی طرف سے ہے اور اگر کوئی نقصان پہنچتا ہے تو کہتے ہیں تمھاری بدولت ہے۔ کہو سب کچھ اللہ کی طرف سے ہے۔ آخر ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ کوئی بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی۔ اے انسان! تجھے جو بھلائی بھی حاصل ہوئی ہے اللہ کی عنایت سے ہوتی ہے اور جو مصیبت تجھ پر آتی ہے وہ تیرے اپنے کسب وعمل کی بدولت ہے۔ اے محمدؐ! ہم نے تم کو لوگوں کے لیے رسول بنا کر بھیجا ہے اور اس پر اللہ کی گواہی کافی ہے۔

یہی وہ آیات ہیں جن میں جبرواختیار کے بارے میں وضاحتیں موجود ہیں۔ بظاہر ان میں ایک درجہ اختلاف بھی پایا جاتا ہے لیکن درحقیقت ان کا اشارہ مسلمانوں کی ایک خاص ہزیمت کی طرف ہے جس میں مسلمانوں کی بھاری تعداد شہید ہوئی۔ جب ہم اس واقعہ اور مسلمانوں کے اعتراضات کو سامنے رکھیں تو اس سلسلہ میں ہماری تمام مشکلات دُور ہو جاتی ہیں۔ موت انسان کے اختیار و اقتدار کے بس میں نہیں۔ ہر ذی روح کو جلد یا بدیر اس کا مزہ چکھنا ہے۔ انسان قسمت کے اُتار چڑھاؤ کے تابع ہے اور یہ اُتار چڑھاؤ بھی اس پر اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے آتے ہیں۔

ان لوگوں کو کیا بیماری لاحق ہو گئی ہے جو وہ ایک سیدھی سادی حقیقت کو نہیں

سمجھ سکتے۔

قرآن پاک نے اس حقیقت کو بار بار دہرایا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک بشر تھے، کوئی فوق البشر نہ تھے۔ مسلمانوں پر جو مصیبت آ کر پڑی وہ ان ہی کی باہمی نااتفاقی اور جھگڑے کا نتیجہ تھی اور اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ایسی باتوں سے باز رہنے کی ہدایت فرمائی ہے۔ جب مسلمان احکامِ الٰہی کی پابندی و متابعت کرتے تھے ہر جگہ کامیاب و کامران ہوتے تھے۔ قرآن پاک میں ارشاد خداوندی ہے:

اگر تم پر کوئی اچھائی ظاہر ہوتی ہے تو وہ اللہ کی طرف سے ہی ہے اور اگر کوئی بدبختی نازل ہوتی ہے تو اس کے ذمہ دار تم خود ہو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکافاتِ عمل کے خدائی قانون کو بدلنے کی کوئی قدرت نہیں رکھتے۔ بلاشبہ اسلامی تعلیمات میں اور قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کی زندگی میں تقدیر پرستی کی مثالیں بڑی کثرت سے ملتی ہیں۔ لیکن یہ تقدیر پرستی اس قسم کی نہیں جس کا طعنہ آج کل اہل مغرب مسلمانوں کو دیتے ہیں۔ اس تقدیر پرستی میں تن آسانی، تن پرستی اور سہل انگاری کی تو قطعاً گنجائش نہیں، اہل مغرب کو ایسی غلط فہمی شاید ترکوں کے اعمال کے جائزے بلکہ نامکمل اور سرسری سے جائزے سے ہوئی۔ ترک سپاہی قوم ہے۔ انھوں نے جنگ کو اپنی اصل زندگی اور امن کو اپنی موت سمجھا۔ میں متحیر ہوں کہ لوگوں نے بحث و تمحیص کے لیے ان آیات کا انتخاب کیا۔

میری رائے میں قرآن پاک کی سیکڑوں دوسری آیات میں جبر و اختیار کے وسیع تر مسائل سے بہتر اور زیادہ سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ جبر و اختیار کا مسئلہ تو ابدیت کے مسئلے کی طرح ہمارے لیے ناقابل فہم اور ان مسائل میں ہے جن پر قرآن حکیم نے کسی بحث و تمحیص کی ضرورت نہیں سمجھی اور ہمیں ان میں اُلجھنے سے باز رہنے کا حکم دیا ہے۔ انسان کو اس دُنیا میں اللہ تعالیٰ کا نائب ہونے کا شرف حاصل ہے جیسا کہ قرآنِ پاک میں ارشاد ہے:

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً ؕ قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ

فِيۡهَا مَنۡ يُّفۡسِدُ فِيۡهَا وَيَسۡفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَنَحۡنُ نُسَبِّحُ بِحَمۡدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ؕ قَالَ اِنِّىۡۤ اَعۡلَمُ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ ○ (البقرہ ۲: ۳۰-۳۱)

پھر ذرا اس وقت کا تصور کرو جب تمھارے رب نے فرشتوں سے کہا تھا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔ انہوں نے عرض کیا: کیا آپ زمین میں کسی ایسے کو مقرر کرنے والے ہیں جو اس کے انتظام کو بگاڑ دے گا اور خون ریزیاں کرے گا؟ آپ کی حمد وثنا کے ساتھ تسبیح اور آپ کے لیے تقدیس تو ہم کر ہی رہے ہیں۔ فرمایا: میں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔

جب تک انسان کو اپنی بے بسی کا احساس و اعتراف ہے اور وہ ان اختیارات کو جو اسے تفویض ہوئے ہیں ایک مقدس امانت سمجھتا ہے' اس کے حق میں بہتر ہے۔ جب وہ اپنی بے بسی کو بھلا دیتا ہے یا اس کا انکار کر دیتا ہے تو وہ راہِ راست سے بھٹک جاتا ہے اس طرح وہ خسران میں رہے گا۔ اس کا اشارہ اس سورۃ میں دیا گیا ہے جو سب سے پہلے نازل ہوئی۔

كَلَّاۤ اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَيَطۡغٰٓى ○ اَنۡ رَّاٰهُ اسۡتَغۡنٰى ○ اِنَّ اِلٰى رَبِّكَ الرُّجۡعٰى ○ (العلق ۹۶: ۶'۷'۸)

بے شک انسان سرکشی کرتا ہے کہ اپنے آپ کو بے نیاز دیکھتا ہے اللہ ہی کی طرف پھر جانا ہے۔

انسان کو اس دُنیا کی حکومت عطا کی گئی اور اس میں موجود ہر قسم کی مخلوقات' نباتات' جمادات پر اس کو اختیار و قدرت عطا کی گئی۔ یہ اس کی ذمہ داری ہے کہ ان اشیاء کو بنی نوع انسان کے فائدے کے لیے بہتر بنائے اور ترقی دے اور ذاتی مفاد و خواہش کے لیے انہیں تباہ و برباد نہ کرے۔ اس پر اپنے ہم جنسوں کے معاملے میں بھی ذمہ داریاں عاید کی گئی ہیں۔ اس کا فرض ہے کہ بنی نوع انسان اور اس کی آیندہ نسلوں کی بہتری و ترقی کے لیے دل و جان سے کوشاں رہے۔

قوانینِ فطرت پر جو تمام کائنات میں روبہ عمل ہیں انسان کا مکمل انحصار' ان

قوانین کی متابعت کے بغیر جو اس کے وضع کردہ نہیں' انگلی ہلانے کا' سانس لینے کی معذوری' رات اور دن کا منظر اور تسلسل اور وہ قوانینِ مکافات جس کے تابع اس کے تمام افعال ہیں' یہ تمام باتیں انسان کے لیے ایک مستقل انتباہ کی حیثیت رکھتی ہیں کہ اس کے اختیار وحکومت کی حدیں محدود ہیں اور ہمیشہ ایک حد درجہ بلند و برتر طاقت کے ماتحت اس کے رحم وکرم پر ہیں۔ لیکن انسان ان تمام باتوں کے باوجود اس صاف وسیدھی بات کو سمجھنے سے معذور ہے جیسا کہ ارشاد ہوا ہے:

''انسان باغی ہے اور اپنے آپ کو بااختیار سمجھتا ہے'' اسی طرح برائی اور گناہ بڑھتے جاتے ہیں۔

مسلمان مردوں اور عورتوں پر اس حقیقت کی اشاعت اور دنیا میں مملکتِ الٰہیہ یعنی عالمگیر اخوت کے قیام کی سعی لازم قرار دے دی گئی ہے۔ مملکتِ الٰہیہ کسی فرقے یا نسل کے لیے مخصوص نہیں کر دی گئی۔ چند اعتقادات کا اعلان یا چند شعائر کی پابندی صداقت کا معیار نہیں۔ معیار تو دُنیا بھر کے لیے ایک ہی ہے' اور وہ ہے عمل!

جہاد

مسلمانوں پر جہاں بھی اور جب کبھی موقع پیش آئے' فلاح و اصلاح کے لیے اور دفیعۂ شر وفساد کے لیے کوشش لازم قرار دی گئی ہے۔ مسلمان اللہ تعالیٰ کی حکمرانی کے قیام کے لیے اپنے آپ کو اس کی رضا کے لیے وقف کر چکے ہیں۔ اس کے لیے تساہل وغفلت اور محض عبادات کام نہیں آتیں بلکہ اس کے لیے عملی کوشش اور جدوجہد کی جاتی ہے۔ جس کی مشکلات اور مصائب و تکالیف مسلمانوں کے لیے دکھ اور رنج کی بجائے آسودگی اور اطمینان کی اس قسم سے تعلق رکھتی ہے جو ایک تیراک کو اس وقت حاصل ہوتی ہے جب طوفان کا زور ٹوٹ جاتا ہے اور وہ لہریں جن کے تھپیڑے اسے غرقاب کرنے پر تلے ہوئے تھے اس کے حق میں مہربان ہو جاتی ہیں اور اسے اپنے دوش پر سوار کر کے اسے اس کی منزلِ مقصود کی طرف لے جاتی ہیں۔

نیکی کی حمایت اور بدی کی مخالفت میں مسلمان کی یہی جدوجہد جو اس کی اپنی

ذات سے شروع ہو کر اس کے ہم جنسوں کو بھی اپنے دائرۂ عمل میں لے آتی ہے اور جس کی انتہائی صورت بوقتِ ضرورت میدانِ جنگ میں کود پڑنا اور شہید ہو جانا ہے، جہاد کہلاتی ہے۔

جہاد میں مسلمان اپنے دنیوی مال و متال اور ہر عزیز شے کو اللہ کے نام پر چھوڑ دیتا ہے۔ وہ اس کی پروا نہیں کرتا کہ موت اسے کب اور کہاں آن لیتی ہے۔ یہی مسلمانوں کی اصلی تقدیر پرستی ہے لیکن یہ ایسی تقدیر پرستی نہیں جس کا نتیجہ زوال اور جمود ہو۔ جب مسلمان امن و امان کے زمانے کے عیش و آرام، تساہل و غفلت کی بدولت جذبۂ جہاد سے محروم ہو گئے اور انھوں نے اس دینی اصلاح کے وسیع المعنی مفہوم کی بجائے اس کے محدود و مختصر مفہوم کو قبول کر لیا جس میں علماء نے انھیں مقید کر دیا تھا تو اسلامی تہذیب روبہ انحطاط و زوال ہو گئی۔

لفظ ''جہاد'' کے پھیلاؤ اور وسعت کو جس طرح محدود و مختصر کر دیا گیا ہے۔ ایسا کسی دوسرے لفظ کے ساتھ شاید ہی کیا گیا ہوگا اور نہ ہی قوموں کے لیے الفاظ کے مفہوم کا تغیر اس قدر ہلاکت آفرین ثابت ہوا ہوگا۔ غیر مسلم تو جہاد کو ملک گیری کی ہوس کی تسکین کے لیے ایک جنگ ہی سمجھتے رہے ہیں جس میں مسلمانوں کا کام ہر غیر مسلم کو زیر کرنا ہے۔ ان کے خیال میں جہاد صلیبی محاربات کی قسم کے جدال و قتال کا نام ہے۔ غیروں کو الگ رکھیے خود مسلمانوں نے بھی جہاد سے مراد ایک ایسی جنگ سمجھ رکھا ہے جو اسلام کی حفاظت کے لیے لڑی جائے۔ یہاں تک کہ خلیفہ اور اس کے نائب وزیر مصر کا محکمۂ جنگ ''النظارۃ الحربیۃ'' نہیں بلکہ ''النظارۃ الجہادیہ'' کہلاتا تھا اور اس کی وجہ یہ غلط قسم کا خیال تھا کہ مسلمانوں کے فرمانروا کے زیر کمان جو جنگ لڑی جائے گی وہ 'جہاد' ہی کہلائے گی۔ فوج کے اعلیٰ حکام کے لیے یہ بہانہ ضروری تھا کیونکہ شریعت کی رُو سے مسلمانوں کو صرف اس جنگ کے لیے پکارا جاتا ہے جس کی نوعیت جہاد جیسی ہو۔ اس لیے جبری بھرتی کے لیے حکم کی یہی وجہ ہو سکتی تھی کہ تمام جنگیں جن میں اسلامی افواج کو شرکت کی دعوت دی جائے گی لازماً جہادی نوعیت ہی کی ہوں گی کیونکہ وہ عالم اسلام کے

علماء کے نمایندے یعنی شیخ الاسلام کے جہاد کے جواز کے فتوے کی بنا پر خلیفۃ المسلمین کے اعلان پر شروع کی جاتی تھیں۔

گذشتہ زمانے میں جب اسلامی دانش گاہیں اپنے اختیار و اقتدار کے شباب پر تھیں، علماء کی حق پرستی' بے باکی و آزادی مسلّم تھی۔ وہ جہاد اور اُن جنگوں میں جو ذاتی مفاد اور ہوسِ ملک گیری کے لیے لڑی جاتی تھیں امتیاز کرتے تھے۔ وہ بے کار ملکوں کو فتح کرنے اور ان پر جبراً قبضہ جمانے کی جنگوں کو خلافِ شرع قرار دیتے تھے۔ اگرچہ ایسے علماء بادشاہوں کی ہوسِ ملک گیری کو ختم نہ کر سکے۔ لیکن ایسی جنگوں پر انھوں نے ایسی سخت پابندیاں ضرور عاید کر دیں جن کی بدولت یہ جنگیں عوام کے لیے باعثِ تکلیف و اذیت نہ رہیں۔ چنانچہ کوئی بادشاہ نہ تو کسی ایسی جنگ میں اپنی مسلمان رعایا کو اپنی حمایت میں شامل ہونے پر مجبور کر سکتا تھا اور نہ ہی اس مقصد کے لیے اس سے کوئی محصول وغیرہ وصول کر سکتا تھا۔ اگر ایک بادشاہ کسی دوسرے بادشاہ سے جنگ کرتا تھا تو اسے ایسی جنگ کے اخراجات خود اٹھانے پڑتے تھے۔ اس کی فوج یا تو اس کے زرخرید غلاموں پر مشتمل ہوتی تھی یا ایسے لوگوں پر جو اپنی رضامندی سے اس کے جھنڈے تلے جمع ہو جاتے تھے۔ بادشاہ اور اس کی فوج کو پرامن مسلمانوں کے جان و مال اور ذریعۂ معاش سے کوئی تعرض کرنے کی اجازت نہ تھی۔ اگر پرامن مسلمان شہریوں اور مسافروں کو کوئی نقصان پہنچتا تو علماء اس کے لیے بادشاہ کو قصوروار قرار دیتے اور ان کے اختیار اور اثر و رسوخ کا یہ عالم تھا کہ وہ ایسے مجرم کے خلاف تمام عالمِ اسلام کو اُٹھا کر کھڑا کر سکتے تھے۔ پس ایسی جنگیں اسلامی تہذیب اور اس کے استحکام کو کوئی نقصان نہ پہنچاتی تھیں۔ عوام افواج کو جنگوں پر روانہ ہوتے ہوئے دیکھتے تھے اور اطمینان سے اپنے کاموں میں مصروف رہتے تھے۔ ان کے لیے ایسی جنگوں میں شکست و فتح کوئی اہمیت نہ رکھتی تھی کیونکہ بادشاہوں کا آنا جانا ان کے لیے کسی انقلاب کا سبب نہ ہوتا تھا۔ شرعی قوانین سب کے لیے ایک جیسے تھے اور ہر فرمانروا پر ان کی اطاعت لازم تھی۔ احکامِ شریعت کے خلاف عمل کرنے کی صورت میں علماء اس کی زجر و توبیخ کے لیے موجود تھے۔ اسی طرح

ان علماء نے غیر مسلموں کے خلاف مسلمانوں کی ایسی جنگوں کی بھی شدید مخالفت کی جو کھلے ہوئے ظلم و استبداد کے خلاف انصاف اور نیکی کے قیام کے لیے نہ لڑی گئیں۔ اگر وہ تمام جنگیں جو مسلمانوں نے اپنی تاریخ میں اب تک لڑی ہیں اسی طرح جذبۂ جہاد کے تحت لڑی جاتیں جیسا کہ قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کا وطیرہ تھا تو آج تمام دُنیا حلقہ بگوشِ اسلام ہو چکی ہوتی اور انسان اخلاقی اور روحانی اعتبار سے بہت بلند مرتبے پر پہنچا ہوتا۔

جہادی جنگیں اسلامی ملکوں کی حفاظت' مظلوموں اور کمزوروں کی مدد وحمایت اور ناانصافیوں کی بیخ کنی کے لیے لڑی جانی چاہئیں۔ ان جنگوں میں نہتے لوگوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہیے۔ مذہبی پیشواؤں اور مذہبی شعائر کا احترام کرنا چاہیے۔ پھل دار درخت نہیں کاٹنے چاہییں نہ فصلوں کو نقصان پہنچانا چاہیے۔

ارشاد ہے: ''ان کے ذرائع معاش مت تباہ کرو''۔ دشمنوں کے لیے یہی قانونِ رسولؐ تھا۔ اس آئینِ رحمت کا مقابلہ ذرا جنگ عظیم اول و دوم میں موجودہ یورپ کے رویے سے کیجیے جس میں دشمن کو فاقوں سے ہلاک کرنا جائز سمجھا گیا۔ پھر دیکھیے کہ کون سا آئین پسندیدہ اور قابلِ تعریف ہے اور اسے اختیار کیجیے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا منشاء جنگ کی ہلاکت خیزیوں اور ہولناکیوں میں کمی کر کے اسے نرم کرنا اور مفتوح قوم کے لیے اس کے نتائج اور عواقب کو اس قدر فائدہ مند اور فیض رساں بنا دینا تھا کہ مفتوحین کے دلوں میں قبولِ اسلام کی خواہش پیدا ہو جائے اور اس طرح دُنیا میں امن و سلامتی کے ایک دور کا آغاز ہو۔ عہدِ رسالتؐ میں ایسا کوئی خیال مسلمانوں میں نہ پایا جاتا تھا' جو بعد میں ان میں پیدا ہوتا رہا کہ کافروں کے خلاف جنگ کرنا ان کا ایک اہم اور مقدس مذہبی فریضہ ہے۔

قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں سے جو شخص بھی صلح کا طلب گار ہوتا تھا اس سے صلح کر لی جاتی تھی اور جب تک وہ اپنے معاہدات پر کاربند رہتا تھا اسے برابر کے حقوق حاصل رہتے تھے۔ مسلمانوں کی معاہدات کی پاسداری اور ایفائے عہد ضرب المثل بن گئے

تھے۔ قرآنِ پاک ہر معاہدہ کو مقدس قرار دیتا ہے اور مسلمانوں نے اس معاملہ میں اپنی شہرت کو برقرار رکھا ہوا ہے۔ جہادی جنگیں اسلامی ثقافت کا ایک حصہ تھیں اور آج اقوام عالم کو ان کے مطالعہ و تقلید سے بہت فائدہ ہوگا۔ پیغمبرؐ اسلام نے اپنی جنگوں میں متعدد بار اپنے دشمنوں کو معاف کر دیا اور اس درگزر کے حیرت انگیز نتائج نکلے۔ اسلامی تعلیمات میں ایک بات البتہ ایسی ہے جس پر ایسے لوگ جو ہر صورت میں جنگ و جدل کے مخالف ہیں، اعتراض کریں گے اور وہ حفاظتِ خود اختیاری، کمزوروں اور بے کسوں کی مدد اور ظلم و بے انصافی کے خلاف جنگ یعنی بعض مخصوص حالات میں جدال و قتال کا حکم ہے۔ اس حکم کو اسلام کے خلاف ایک حد درجہ شرم ناک بہتان بنا لیا گیا ہے۔ مسٹر لائیڈ جارج برطانوی وزیر اعظم نے جنیوا کانفرنس میں اور اس وقت ایک ہندستانی جج نے قرآنِ پاک کے الفاظ ''انھیں جہاں پاؤ قتل کرو'' کو دہرایا۔ لیکن ایسا کرنے میں انھوں نے ان الفاظ کے موقع و محل کو یکسر الگ کر دیا۔ اس طرح ان الفاظ کا مطلب یہ دکھائی دینے لگا کہ مسلمانوں پر ہر جگہ، ہر وقت، ہر زمانے میں غیر مسلموں کا قتل اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرض کر دیا گیا ہے۔ یہاں میں قرآنِ پاک کی ان آیات کو نقل کرتا ہوں جو اس حکم سے متعلق ہیں:

وَقَاتِلُوْا فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ۝ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ وَاَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَيْثُ اَخْرَجُوْكُمْ وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ۚ وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقٰتِلُوْكُمْ فِيْهِ ۚ فَاِنْ قٰتَلُوْكُمْ فَاقْتُلُوْهُمْ ؕ كَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ ۝ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ؕ فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ

(البقرہ ۲: ۱۹۰-۱۹۳)

اور تم اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں مگر زیادتی نہ کرو اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ ان سے لڑو جہاں بھی تمھارا ان

سے مقابلہ پیش آئے۔ اور انھیں نکالو جہاں سے انھوں نے تم کو نکالا ہے۔
اس لیے کہ قتل اگرچہ برا ہے مگر فتنہ اس سے بھی برا ہے اور مسجدِ حرام کے
قریب جب تک وہ تم سے نہ لڑیں تم بھی نہ لڑو۔ مگر جب وہ وہاں لڑنے سے
نہ چوکیں تو تم بھی بے تکلف انھیں مارو کہ ایسے کافروں کی یہی سزا ہے۔ پھر
اگر وہ باز آ جائیں تو جان لو کہ اللہ معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔
تم ان سے لڑتے رہو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین اللہ کے لیے ہو
جائے۔ پھر اگر وہ باز آ جائیں تو سمجھ لو کہ ظالموں کے سوا اور کسی پر دست
درازی روا نہیں۔

اب کون باشعور، ذی فہم شخص اسے قتلِ عام کا حکم اور بلا جواز خونریزی کی ہدایت سمجھے گا؟ یہ تو محض ایک اصولِ جنگ ہے جو انتہائی سادہ الفاظ میں ان لوگوں کے سامنے بیان کیا گیا ہے جنھوں نے اس وقت سے پہلے تک ہر حالت اور صورت میں انسانی جان لینا حرام سمجھا ہوا تھا کیونکہ مسلمان اس حکم کے آنے سے پہلے جنگ کے خلاف تھے اور اس حکم کی متابعت میں بھی انھیں اپنے مذہب کو تسلیم کروانے کے لیے نہیں بلکہ اپنے عقائد کی آزادی کی خاطر ان لوگوں سے مصروفِ پیکار ہونا تھا جو مسلمانوں کو طرح طرح کی تکلیفیں پہنچا رہے تھے اور اسلام کی (العیاذ باللہ) بیخ کنی کے منصوبے بنا رہے تھے۔ مسلمانوں کو اس وقت تک جنگ کا حکم دیا گیا تھا جب تک مذہبی جھگڑوں اور مناقشتوں کا خاتمہ نہ ہو جائے اور لَآ اِکْرَاهَ فِي الدِّيْنِ [ط] کے قرآنی اصول پر عمل درآمد نہ شروع ہو جائے اور دین کی مکمل آزادی ہو جائے اور سب کے لیے دین کا معیار عمل ہی قرار پائے۔ کیونکہ اللہ سب کا ہے اور کوئی مخصوص فرقہ یا جماعت اس کی منظورِ نظر نہیں۔ ایک مسلمان کو دُنیا کے کسی مجمعے کے سامنے یہ بات (قتل سے متعلق) کہنے کی ضرورت پیش نہیں آنی چاہیے تھی۔ لیکن اس دُنیا میں جہالت زیادہ ہے اور غلط فہمیاں عام ہیں اس لیے مجھے یہ وضاحت کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی ہے کہ قرآنِ پاک میں قتل یا قتل عام کا کسی بھی حالت میں قطعاً کوئی جواز نہیں۔ لیکن بعض مخصوص حالات میں ایک آبرومندانہ

جنگ کا حکم ضرور موجود ہے لیکن اس حکم پر بھی ایسی پابندیاں موجود ہیں جن پر اسلام کی فتح یابی منحصر رہی ہے۔ کیونکہ اسلامی نظامِ جنگ نے ان لوگوں کو جو جنگوں کی تباہ کاریوں اور ہلاکتوں کو دیکھنے کے عادی چلے آ رہے تھے' متحیر کر دیا۔ اسلام میں جنگ صرف ایک ہی ہے اور وہ جہاد ہے۔ جہاد کوشش اور جدوجہد کا نام ہے۔ جہاد کا دینی مفہوم اس تمام جدوجہد پر حاوی ہے جو ایک سچے مسلمان کو قرآنِ پاک کی اطاعت میں تاعمر ایسے دینی فرائض کی ادائیگی کے سلسلے میں کرنی پڑتی ہے جو ہر عمل میں اس کا معیار ہیں۔ اس کا مقصد انسانوں کے دلوں میں اللہ کی حکمرانی و حاکمیت کا تصور قائم کرنا ہے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو وہ سچا مسلمان نہیں۔ یہ کوشش ہر مسلمان کے لیے ہر شعبۂ زندگی میں بھلائی کے لیے برائی کے خلاف ایک جنگ ہے اور اس کا آغاز خود مسلمان کے قلب سے ہوتا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: اَلْجِهَادُ الْاَكْبَرُ الْهَوٰى ـــــ یعنی سب سے افضل جہاد انسان کا اپنے نفس کے خلاف جہاد ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی حاکمیت یعنی اس کا احکم الحاکمین ہونا اور اسلامی اخوت کے حقوق کی وسعت کا بہترین طریقہ خود مسلمان کے لیے اپنی نیکی و پارسائی کی مثال قائم کرنا ہے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حصولِ علم اور اشاعت علم کی کوشش کو بھی جہادِ اکبر قرار دیا ہے۔ آپؐ کا ارشاد گرامی ہے: ''طالب علم کے قلم کی روشنائی شہید کے خون سے زیادہ مقدس ہے''۔

جہاد کی اصطلاح کا اطلاق اس سعی پر بھی ہے جو ایک فنکار اپنے ہنر کو عروج و تکمیل پر پہنچانے کے لیے کرتا ہے اور ان مساعی پر بھی جو لوگ وبا زدہ مقامات پر بیماروں کے علاج معالجہ اور مرحومین کی تجہیز و تکفین کے سلسلے میں کرتے ہیں۔ ضرورت مندوں کی مالی امداد' ظلم و ناانصافی پر صبر و استقلال غرض یہ کہ ہر وہ انسانی کوشش جس کا مقصد اصلاحِ احوال' حق و صداقت کی حمایت و تائید اور ظلم کی بیخ کنی ہو' جہاد ہی کہلاتی ہے۔ قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کی تجارت جہاد ہی تھی۔ کیونکہ تجار جذبۂ جہاد سے سرشار ہو کر سفروں پر نکل جاتے تھے۔ ان کا جذبۂ تبلیغ ہی ان کا جہاد تھا۔ ان کا رویہ اپنے کاروباری طرائق کے سلسلے میں ایمان دارانہ اور دیانت دارانہ ہوتا تھا۔ وہ اپنے

معاہدات کی سختی سے پابندی کرتے تھے۔ انھوں نے جہاں کہیں بھی قدم رکھا وہاں قرآن کا پیغام بھی پہنچ گیا۔ عرب تاجروں میں جذبۂ تبلیغ آج بھی اپنی پرانی گرم جوشی اور خلوص کے ساتھ موجود ہے۔ ان حالات میں جہاد کے معنی و مطالب کو صرف جنگ اور وہ بھی مذہبی جنون کی جنگ سمجھ لینا انتہائی افسوس ناک غلط فہمی ہے۔ ہر وہ مسلمان جو مجاہد کے خطاب کا مستحق ہے' اسے ہمیشہ ایسے مقاصد کی حفاظت کے لیے جن کی صحت و سچائی پر اسے کامل یقین ہو' وقت پڑنے پر اپنی جان تک قربان کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ جہاد اور ایسی جنگ میں جو جذبہ حب الوطنی سے سرشار ہو کر لڑی جاتی ہے اور جو متقضی ہے کہ ایک مسلمان اپنے ملک کی خاطر ہر صورت میں جان نثار کرنے کے لیے تیار ہے' نمایاں فرق ہے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

وہ ہم میں سے نہیں جو ظلم اور ناانصافی میں اپنے قبیلے کا ساتھ دیتا ہے اور وہ بھی ہم میں سے نہیں جو دوسروں کو ظلم اور ناانصافی میں شمولیت کی دعوت دیتا ہے۔ وہ بھی ہم میں سے نہیں جس کی موت اس حالت میں ہو کہ وہ ظلم میں اپنے قبیلے کی مدد کر رہا ہو۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ اپنے اس ارشادِ گرامی سے سامعین کو متحیر کر دیا کہ: ''اپنے مسلمان بھائی کی مدد کرو جب وہ اچھا کام کر رہا ہو اس وقت بھی اس کی مدد کرو جب وہ برا کام کر رہا ہو''۔ صحابہؓ نے عرض کی: ''یارسولؐ اللہ کیا ہم ظلم اور زیادتی میں بھی اپنے مسلمان بھائی کی مدد کریں؟'' آپؐ نے فرمایا: ہاں جب وہ برا کام کر رہا ہو تو اس کا ہاتھ پیچھے کھینچ لو''۔

مسلمان وہ ہیں جو قرآنی مفہوم کے مطابق جہاد فی سبیل اللہ میں شریک ہوتے ہیں یعنی وہ اپنی حفاظت کے لیے' کمزوروں اور ناتوانوں کی حفاظت کے لیے اور ظلم و ناانصافی کی بیخ کنی کے لیے جنگ کرتے ہیں۔ اسلام مذہبی اختلاف کی بنیاد پر اقوام و افراد کے خلاف جنگ کرنے کی اجازت نہیں دیتا نہ ہی ایسی جنگوں کو ''جہاد'' کا مقدس نام دیا جا سکتا ہے۔ جہاد تو اللہ کی راہ میں جنگ کا نام ہے۔ کوشش کا نام ہے۔ اگر ہم عہدِ حاضر کی زبان میں اس کی تعریف کرنا چاہیں تو ہم کہیں گے کہ جہاد بنی نوع انسان کی

ترقی کے لیے ایک روشن و تابناک راستہ ہے۔ اگر کوئی قوم مسلمانوں پر ظلم ڈھائے' ان کی تباہی و بربادی اور انھیں غلام بنا لینے کے درپے ہو اور حق وصداقت کو بزور شمشیر دبانا چاہے تو ایسی صورت میں تمام مسلمانوں کو ایسی قوم کے خلاف جنگ کرنے کا حق ہے اور حکم دیا گیا ہے۔ اگرچہ جہاد یعنی نیکی کے لیے جدوجہد کو مسلمانوں کا مقدس فریضہ قرار دیا گیا ہے۔ لیکن انھیں ہرگز یہ خیال نہ کرنا چاہیے کہ اللہ ان کی مساعی کا محتاج ہے۔ جیسا کہ قرآن پاک میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَمَنْ جَاهَدَ فَإِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ ○
(العنکبوت ۲۹:۶)

اور جو کوئی کوشش کرتا ہے' اپنے بھلے کے لیے کرتا ہے' بے شک اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کی امداد سے بے نیاز ہے۔

انگریزی زبان میں اس حقیقت کی تشریح کے لیے کئی محاورات موجود ہیں مثلاً ''نیکی خود اپنا اجر ہے'' — ''ہمت مرداں مدد خدا'' — وغیرہ' لیکن دُنیا پر ان ضرب الامثال کی موزونیت اور سچائی جس عمدگی کے ساتھ قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کے عمل میں ظاہر ہوئی اور کہیں دیکھنے میں نہیں آئی۔ ایک انسان کی مثال کا اثر لیتے ہوئے بے شمار انسانوں کی نیکی کے حصول اور پھیلاؤ کی بے لوث مساعی ہی کا نتیجہ دُنیا میں ایک شاندار تہذیب کے قیام کی صورت میں نکلا۔ یہ تہذیب دل خوش کن رہی اس وقت تک جب تک اس کوشش کو ترک نہ کر دیا گیا۔

فَإِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ○ إِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ○ فَإِذَا فَرَغْتَ فَانصَبْ ○ وَإِلَىٰ رَبِّكَ فَارْغَبْ ○ (الم نشرح :۵-۸)

پس حقیقت یہ ہے کہ تنگی کے ساتھ فراخی بھی ہے۔ بے شک تنگی کے ساتھ فراخی بھی ہے لہٰذا جب تم فارغ ہو تو عبادت کی مشقت میں لگ جاؤ اور اپنے رب ہی کی طرف راغب ہو۔

بعد میں آنے والے زمانے کے مسلمانوں نے اس حقیقت سے صرف نظر کرنا

شروع کر دیا اور جب انھیں جنگوں سے فرصت ملی اور سعی و عمل کی ضرورت نہ رہی تو وہ سست الوجود بن گئے۔ تن آسانی کے عادی ہو گئے۔ اس طرح اسلامی تہذیب کی قوت و سطوت رو بہ زوال ہونی شروع ہو گئی۔ یہ زوال اب تک جاری ہے۔ اسلام کا سیدھا سادہ مگر مضبوط ضبط و نظم جس کی ابتدا مسلمان کے نفس سے ہوتی ہے، غیر مسلموں کے لیے جو اس بات کے تصور سے عاری ہیں کہ کوئی مرد یا عورت اپنے ذمے ایسے کام ہی کیوں لے جن میں اس کے لیے کوئی خوشی یا فائدہ نہیں، اور جس کا اسے حکم دیا جاتا ہے، جہاد کے معاملے میں قابلِ فہم ہو جاتا ہے یعنی یہ ایک بے لوث و بے غرض جدوجہد ہے۔ جس کے لیے ہر شخص کو ایک خصوصی تربیت کی ضرورت ہے۔ ہماری نمازیں، روزے اور حج اس جذبۂ جہاد کے بغیر محض بے روح رسومات سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔ مسلمان کے لیے توحید کا اقرار ہی کافی نہیں۔ اس پر احکامِ شریعت کی پابندی اور اطاعت بھی لازم ہے۔ دوسرے مذاہب والوں سے تو محض عقیدہ کے اقرار اور اعلان کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے وجود کا زبان سے اقرار اور عمل سے اس کی تصدیق نہ کرنا درحقیقت ایک فرض کی ادائیگی سے عملاً انکار کے مترادف ہے۔ یہ ثواب نہیں ایک گناہ ہے۔ اسلام میں معیار، عمل ہے۔

سپاہیانہ تربیت کی ضرورت

ایک دوسرے مذہب کے پیشوایان نے گوہر افشانی کی ہے کہ انسان پر خود اس کی ذات سے متعلق کوئی فرائض نہیں عائد ہوتے۔ البتہ اللہ تعالیٰ اور پڑوسی کے بارے میں اس پر ضرور فرائض عائد ہوتے ہیں اور خود اس کی ذات سے تعلق رکھنے والے فرائض انھی دو فرائض میں شامل ہو جاتے ہیں۔ اسلامی نظریہ اس سے مختلف ہے۔ اسلامی شریعت واضح طور پر یہ اعلان کرتی ہے کہ ہر انسان پر خود اس کی اپنی ذات کے بارے میں ایک فرض عائد ہوتا ہے اور وہ ہے فریضۂ جہاد ـــــ جس کے معنی بدی کی قوتوں کی بیخ کنی کے ذریعے نیکی کا قیام اور پھیلاؤ کے ہیں۔ جہاد کی ابتدا اس طرح ہونی چاہیے کہ مسلمان اپنے نفس کی تحریصات اور غلط تحریکات کے خلاف لڑے ان پر قابو

پانے کی کوشش کرے۔ ہر انسان پر اس کی اپنی ذات سے متعلق جو فرائض عائد ہوتے ہیں ان میں ایک فریضۂ جہاد یعنی مخصوص اور مقررہ حالات میں بے دریغ میدانِ جنگ میں کود پڑنا بھی شامل ہے۔ خواہ زندگی بھر اسے کسی جنگ میں شمولیت کا موقع نصیب نہ ہو۔ جہاد کے لیے اس کی آمادگی اور تربیت محض سپاہیانہ تربیت ہی نہیں بلکہ نظم و ضبط کا مرقع بھی ہے۔ جنگ کے حکم کا لازمی نتیجہ مسلمانوں میں عالمگیر سپاہیانہ تربیت ہے جو ہر اسلامی حکومت میں قانونی طور پر لازم ہونی چاہیے۔ ہر مسلمان کے لیے لازم ہے کہ وہ ایک تربیت یافتہ مجاہد ہو تاکہ وہ جہادِ زندگانی میں جو باطل قوتوں کے خلاف ہر جگہ اور ہر مقام پر، خود اس کے ضمیر اور قلب کی کارگاہ میں، گھر و بازار میں، حکومتی مجالس اور قانون ساز اداروں میں اور محاذِ جنگ میں برپا ہے، شمولیت اختیار کر سکے۔ مسلمان کو دُنیاوی زندگی کے جھمیلوں میں اس حد تک نہیں اُلجھ جانا چاہیے کہ جب اچانک ہی اسے اپنے دُنیاوی مال و متاع سے محروم ہونا پڑے تو یہ اس کے لیے کڑی آزمایش ثابت ہو۔ مسلمان کی زندگی اور جہاد کے حکم کا تقاضا ہے کہ اگر اس کے گھربار، مال و متاع، معاش و کاروبار، پُرامن زندگی اور احکامِ الٰہی کی اطاعت میں کوئی تصادم پیدا ہو جائے تو اسے ان سب سے منہ موڑ کر صرف رضائے الٰہی کے لیے ہجرت کے لیے تیار ہو جانا چاہیے اور دُنیاوی آسایشوں اور مال و دولت سے محرومی پر غم و رنجیدگی کی بجائے صبر و شکر کو اپنا شعار بنانا چاہیے۔ اسی طرح دلی سکون و اطمینان کی دولت حاصل ہوتی ہے۔

توشۂ آخرت

موت ایک اٹل حقیقت ہے۔ زندگی کے بعد موت ہر ذی حیات کو لازماً آتی ہے۔ انسان جب اس دُنیا سے جاتا ہے تو اپنے ساتھ کیا لے جاتا ہے؟ کچھ نہیں۔ لیکن آخرت میں کچھ چیزیں ضرور ہماری منتظر ہوں گی اور ہماری سزا اور جزا کا فیصلہ انھی پر ہوگا۔ قرآنِ پاک کے الفاظ میں "ما قدمت ایدینا" یعنی "جو کچھ ہمارے اپنے ہاتھوں نے ہم سے قبل بھیجا"۔ اور یہ ان کوششوں کا ریکارڈ ہوگا جو نیکی کی حمایت میں، زمین پر اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کے قیام کے سلسلے میں، کمزوروں، زیردستوں، ناداروں اور

مظلوموں کی امداد اور ظلم و تعدی اور فتنہ وفساد کے انسداد میں ہم نے کیں۔ یعنی ہمارے ''جہاد'' کا ایک حساب' دولتِ دُنیا ایک عطیۂ خداوندی ہے۔ وہ جسے چاہتا ہے بخش دیتا ہے' عطا کر دیتا ہے' جسے چاہتا ہے اس سے محروم کر دیتا ہے۔ دولت ایک امانت ہے جو ہمارے لیے بعض اوقات ایک کڑی آزمائش اور اصولوں کی پرکھ کے لیے ایک عملی کسوٹی کا کام دیتی ہے اور بعض حالات میں اس کی صورت ایک سزا اور عذاب کی صورت بھی اختیار کر لیتی ہے۔ روحانی نکتۂ نگاہ سے یہ ایک خطرناک اور تکلیف دہ عارضی عطیہ ہے۔ ہمارے لیے اگر ثبات و دوام ہے تو اسی اللہ تعالیٰ کے وعدے کو اور قابل اعتبار ہے تو یہی کلامِ الٰہی کہ ''وہ لوگ جو ایمان لاتے ہیں اور نیکی اور پرہیزگاری کے حصول کی سعی کرتے ہیں اور جو لوگ اپنے گھروں سے ہجرت کرتے ہیں اور اللہ کی راہ میں اپنے مال ومتاع سے دست کش ہو جاتے ہیں۔

فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ○ (البقرہ ۲:۲۷۴)

تو اس کا اجر ان کے رب کے پاس ہے اور انھیں کوئی خوف نہیں اور نہ وہ غم کریں گے۔

اسلام اور جدید تہذیب

یہی اسلام کی تقدیر پرستی ہے لیکن یہ وہ تقدیر پرستی نہیں جس کا ہمیں اب تک سبق دیا جاتا رہا ہے۔ یہ درحقیقت ایک جہدِ مسلسل اور عملِ پیہم کا نام ہے' درحقیقت جہاد ایک انتہائی شان دار اور پاکیزہ زندگی ہے جو ہر مسلمان گزار سکتا ہے۔

جدید تہذیب اور اسلامی تہذیب میں تطابق کی ضرورت

جدید تہذیب نے مسلمانوں کے دلوں اور ذہنوں میں ایک خلفشار سا پیدا کر دیا ہے۔ وہ اس تہذیب سے اس لیے گریزاں ہیں کہ وہ اسے ایثار وقربانی کی بجائے حرص و طمع اور سودخواری کا مظہر سمجھتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ اس سے دُور ہی دُور رہتے ہوئے

اپنے لیے کوئی راہِ نجات تلاش کریں۔ آج اکثر کاموں اور پیشوں کے لیے انھیں کوئی مذہبی جواز نظر نہیں آتا۔ تجارت آج ایک جان لیوا مقابلہ اور جھوٹ گھڑنے کا کاروبار بن چکی ہے۔ قانون بہانہ ساز بن کر رہ گیا ہے۔ سائنس کو خودغرضی اور ہلاکت خیزیوں کا آلہ بنالیا گیا ہے۔ غرض یہ کہ قرآنِ پاک کے الفاظ میں:

كَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰىٓ o اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى (سورہ العلق: ۵-۷)

ہرگز نہیں، انسان سرکشی کرتا ہے اس بنا پر کہ وہ اپنے آپ کو بے نیاز دیکھتا ہے۔

لیکن مسلمانوں کے لیے زندگی کے میدان سے کنارہ کشی کر جانے کی کوئی وجہ نہیں ہے بلکہ ان پر لازم ہے کہ وہ ہر قسم کے نامساعد حالات کے خلاف میدانِ عمل میں نکلیں اور پامردی سے سینہ سپر ہو جائیں کیونکہ اسلام کی تعلیم ہی انسانوں کو اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کے تابع لے آنا ہے۔ جہاد کے تصور اور عمل اور مسائلِ حاضرہ میں ربط و تطابق پیدا کرنا وقت کی ضرورت ہے اور ایسا صرف اسلامی تعلیمات اور شعائر کے احیائے جدید ہی سے ممکن ہے۔

اگر موجودہ معاشرے کی بنیاد سود پر ہے تو مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ ایک ایسا معاشرہ قائم کریں جس میں سود کا نام و نشان تک نہ ہو۔ اگر قوانینِ شریعت آج محض ایک کھیل تماشا کا نام بن کر رہ گیا ہے تو مسلمانوں کو چاہیے کہ انھیں حقیقی معنوں میں رائج کریں اور شرعی احکامات کی متابعت اپنے اوپر فرض قرار دے دیں اور اسے دین و دُنیا میں سرخروئی کا ذریعہ سمجھیں۔ اگر مسلمانوں کی نگاہ میں موجود بنک کاری نظام سود پر مبنی ہے تو انھیں ایک اسلامی بنک کاری نظام قائم کرنا چاہیے جس کی بنیاد سود کے بجائے اخوت پر ہو۔ انھیں نظامِ زکوٰۃ اور بیت المال دوبارہ قائم کرنے چاہییں۔ اگر موجودہ تجارتی طرائق مسلمانوں کے نزدیک قابل قبول نہیں تو انھیں تجارت امداد باہمی کے اصولوں پر شروع کر دینی چاہیے۔ اگر موجودہ صنعتی نظام ان کی نگاہ میں خود غرضانہ اور ظالمانہ ہے تو انھیں چاہیے کہ وہ قانونِ شریعت کی بنیاد پر ایک جداگانہ صنعتی نظام قائم

کریں۔ مسلمانوں کے لیے موجودہ تہذیبِ جدید میں ضم ہو جانا سراسر خودکشی کے مترادف ہوگا کیونکہ اس کا مطلب تہذیبِ جدید کے تمام عیوب کو قبول کر لینا ہوگا۔ اگر مسلمانوں نے ایسا کیا تو وہ کبھی دُنیا میں نیکی کے مد و معاون اور سہارا ثابت نہ ہوں گے۔ لیکن ان کے لیے اس تہذیب کو یکسر نظرانداز کر دینا اور اس کی کارکردگی سے یکسر بیگانگی بھی خودکشی سے کم نہ ہوگی۔ مسلمان اپنے شان دار اور پرشکوہ ماضی کی یادوں کے سہارے ہی زندہ نہیں رہ سکتے۔ ایسا کرنے سے وہ اسلام سے اس طرح دُور ہو جائیں گے جس طرح ایک غیر اسلامی تہذیب کو بالکلیہ طور پر قبول و اختیار کر لینے سے۔ عہدِ حاضر کے مسلمانوں کا جدید تعلیم کا اس غرض سے حاصل کرنا کہ وہ جدید عہد کے عیوب و محاسن سے اچھی طرح سے آگاہ ہو جائیں' جہادِ اکبر کا درجہ رکھتا ہے۔ مسلمانوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ نیکی اور بدی میں امتیاز کریں۔ اچھائی کو قبول کریں' برائی کی بیخ کنی کے لیے ہر دم آمادہ رہیں۔ دُنیا آج ہلاکت و تباہی کے دھانے پر کھڑی ہے اور مسلمان ہی اسے اس کے بھیانک انجام سے بچا سکتے ہیں۔ کیونکہ تہذیب کا معیار ان کے پاس ہے اور صرف وہی ایک متبادل مکمل تہذیبی نظام قائم کر کے دکھا سکتے ہیں اور وہ ایک ایسا نظام ہے جس کے لیے ان کے پاس اللہ کی سند موجود ہے اور وہ نظام گذشتہ زمانے میں انتہائی حیرت ناک کامیابی کے ساتھ زیرِعمل رہ چکا ہے۔ اسلامی نظام ہی وہ نظام ہے جو ہر عہد کے تقاضوں سے ہم آہنگ اور مستقبل میں کامیابی و کامرانی کا ضامن ثابت ہو سکتا ہے۔ یورپ کے انقلابی نظاموں کے متعلق' جو زیرِعمل رہ چکے ہیں' ایسا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔ وہ تمام نظام انسانی مسرتوں میں معمولی سا اضافہ کرنے سے قاصر رہے ہیں۔ ہمیں یہ بات خوب اچھی طرح سے ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ دوسری اقوام کے خلاف اپنی قوم کی کامیابی کی کوشش اس امر کے لحاظ کے بغیر کہ ہم حق پر ہیں یا نہیں' جہاد نہیں کہلا سکتی۔ جہاد تو حق کی خاطر ایک جنگ ہے جو باطل کے خلاف کسی بھی جگہ اور کسی بھی صورت میں لڑی جاتی ہے۔ اگر آپ اس غلط فہمی کا شکار ہیں کہ جہاد کے اس تصور کا سراغ تاریخ اسلام میں نہیں ملتا تو اللہ سے دعا ہے کہ وہ آپ کو صراطِ مستقیم دکھائے۔

خلفائے بنی اُمیہ اور بنی عباس نے مشرقی رومی سلطنت سے جو معاملات کیے ان کا مطالعہ کیجیے۔ ہسپانیہ کے اموی خلفاء نے مغرب کی عیسائی سلطنت سے جو سلوک روا رکھا اس کے بارے میں پڑھیے تو آپ پر عیاں ہو جائے گا کہ ان کا مقصد باطل کے خلاف حق کی تائید ہی کا جذبہ تھا۔ سلطان سلیمان پرشکوہ کا شاہِ فرانس فرانسس کے نام خط دیکھیے جو اس وقت لکھا گیا جب وہ (فرانسس) ایک قیدی تھا اور اسے اپنی تمام تر دولت سے بے جا طور پر محروم کر دیا گیا تھا' تو آپ کو یہ اصول اور اس کی حمایت میں مساعیٔ جمیلہ کی شاندار مثالیں دکھائی دیں گی۔ مسلمان کا منشا اس دُنیا میں اپنی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اور شریعت کی حکومت قائم کرنا ہے اسلامی شریعت کی بنیاد ایسے قوانین ہیں جو تمام بنی نوعِ انسان کے لیے ہیں اور مسلمہ عالم گیریت کے حامل ہیں۔ کسی گھٹیا اور پست مقصد کے لیے ان کا استعمال ان کی غلط توجیہ ہی نہیں بلکہ ہلاکت اور تباہی کا راستہ ہے۔ بنی نوعِ انسان کی فلاح اور برتری کے وسیع تر مقصد کی عدم موجودگی میں کوئی کوشش جہاد کے بلند و ارفع مقام تک پہنچنے کی حق دار نہیں۔

مسلمان کی تقدیر پرستی جس کے بارے میں اتنا شور مچایا جاتا ہے' ایک ایسی ناگزیر حالت یا کیفیت ہے' جس کا اعتراف چاہتے ہوئے یا نہ چاہتے ہوئے کرنا ہی پڑتا ہے۔ ہمیں فراخ دلی کے ساتھ یہ اعتراف کر لینا چاہیے کہ ہماری موجودہ حالت اللہ کی مرضی ومنشا کے تحت ہم پر مسلط کر دی گئی ہے۔ لیکن ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ مسلمان کا جہاد ہمیشہ کی طرح اب بھی بدی کے خلاف نیکی کے لیے ایک سعیٔ پیہم کی صورت میں جاری رہنا چاہیے۔ ہمارا مقصدِ اعلیٰ یہ ہونا چاہیے کہ پہلے تو ہم اسلامی اخوت کی بنیادیں موجودہ حالات کے تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے از سرنو استوار کریں۔ اس کے بعد ہمارا فرض ہوگا کہ اپنے نیک اعمال سے لوگوں کے دلوں میں اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کا احساس پیدا کریں۔

ooo

خطبۂ ہفتم

اسلام میں عورت کا مقام

''اسلام میں عورت کا مقام'' ایک انتہائی نازک موضوع ہے۔ اس موضوع کی نزاکت کا مجھے پورا پورا احساس ہے۔ میرے نزدیک یہ موضوع نازک ہی نہیں بلکہ انتہائی درجہ افسوس ناک بھی ہے کیونکہ اس موضوع پر بات کرتے ہوئے مجھے ہر قدم پر یہ احساس ہوتا ہے کہ میں اس ملک میں ہوں جہاں عورت کو بڑی حد تک اپنے اسلامی مرتبے سے محروم رکھا گیا ہے اور جہاں مرد عورتوں پر ناروا ظلم کرتے ہیں اور ان کے حقوق کی ادائیگی سے پہلوتہی کرتے ہیں۔ ہندستان میں مسلمان عورتوں کی اکثریت اسلام کے عطا کردہ اپنے معزز و محترم مقام سے نیچے گر چکی ہے اور یہ جس ذلت میں مبتلا ہو چکی ہے وہ اسلام کی سراسر توہین ہی نہیں ایک سنگین جرم بھی ہے۔ جس کی پاداش میں مسلمانوں کو معاشرتی پستی، معاشی تنزلی، کمزور اور بیمار بچے اور بچوں کی بکثرت اموات کا عذاب اس وقت تک بھگتنا پڑے گا جب تک وہ اپنی عورتوں کو ان کا حقیقی مرتبہ اور مقام نہیں دے دیتے۔ اس بے انصافی اور جرم کا آغاز مسلمانوں کی اکثریت کی طرف سے غیر شعوری طور پر نادانی اور جھوٹی شیخی کی غیر اسلامی روایات اختیار کرنے سے ہوا۔ لیکن قانون سے لاعلمی کسی شخص کو اس کی خلاف ورزی کے نتائج و عواقب سے نہیں بچا سکتی۔ قوانینِ فطرت کی خلاف ورزی کی سزا سے تو بالخصوص کوئی شخص ناواقفیت کا بہانہ کر کے نہیں بچ سکتا۔ اسلامی شریعت کے قوانین درحقیقت قوانینِ فطرت ہیں اور ان کی خلاف ورزی کے نتائج و عواقب سے مسلم غیر مسلم کسی کو مفر نہیں۔ ایسا شاید کوئی فاترالعقل شخص ہی

کہہ سکتا ہوگا کہ آگ کا کام جلانا نہیں ہے۔ آگ اس کی بے وقوفی یا علمی کی وجہ سے اپنی فطرت سے باز نہیں رہ سکتی۔ لیکن مسلمانوں کی طرف سے شرعی احکامات سے لاعلمی کا عذر تو ''عذرِ گناہ بدتر از گناہ'' کہلا سکتا ہے۔ کیونکہ تمام انسانوں میں انھی پر یہ فرض بطورِ خاص عاید کیا گیا ہے کہ وہ علم حاصل کریں اور اسے تمام انسانوں میں پھیلائیں۔

میری آپ سے درخواست ہے کہ از راہِ کرم آپ میری زبان سے ہندستان میں مسلمان عورتوں کی موجودہ حالتِ زار کی مذمت سن کر یہ مت سوچیے کہ میں ان کی حالتِ زار کا اندازہ غیر اسلامی معیار سے کر رہا ہوں یا غیر اسلامی طریقوں کو اختیار کرنے کی ہدایت کر رہا ہوں۔ میرا معیار اسلامی ہے اور میں اسلامی طرائق اختیار کرنے کا حامی ہوں۔ میں تو مشرق و مغرب دونوں میں عورتوں کی حیثیت اور مقام کو اسلامی معیار پر جانچتا ہوں۔ اس طرح میں ہر عہد کے روشن خیال مسلمانوں کی تقلید کرتا ہوں۔

قرآنِ پاک میں آیا ہے:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ۝ (سورہ البقرہ ۲: ۱۴۳)

اور اسی طرح تو ہم نے تمھیں ''اُمتِ وسط'' بنایا ہے تاکہ تم دُنیا کے لوگوں پر گواہ ہو اور رسولؐ تم پر گواہ ہو۔

یقیناً رسولؐ اللہ آج عورتوں کی حالتِ زار سے متعلق آپ لوگوں کے خلاف گواہ ہیں۔ ذرا ان کا ارشادِ گرامی بھی سن لیجیے:

علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت کا مقدس فریضہ ہے۔

میں جانتا ہوں کہ آپ میں ایک خاص اور ذی اثر گروہ کی یہ قطعی رائے ہے کہ علم سے مراد صرف علمِ دین ہے۔ قرآن پاک نے اور رسولؐ اللہ نے دینی اور دنیوی علوم کو کبھی الگ الگ حیثیت نہ دی۔ ایک سچے مسمان کے لیے تمام زندگی مذہبی زندگی ہے اور تمام علم سراپا مذہب ہی ہے۔ اسلام کی صحیح تعلیم کے مطابق حقائق کی وضاحت و تصریح کا حق اسے پہنچتا ہے جو اپنے علم اور زندگی کے تجربات کے سبب خاص حیثیت اور مرتبے

کا حامل ہو اور مسلمانوں کے مسائل کا بہتر حل پیش کرنے کا اہل ہو۔ میں محدود اور ناقص علم کے حامل ناتجربہ کار لوگوں کو دینی راہنمائی کا منصب عطا کرنے کے خلاف ہوں۔ میری رائے میں اس قسم کے علماء کو ایسی ذمہ داری کا کام سونپنا' رسول اللہ اور مسلمانوں کے درمیان ایک ملایانہ حد کھڑی کرنا ہے۔ قرآنِ حکیم نے بھی جگہ جگہ اس کی مذمت کی ہے اور گذشتہ صدیوں میں مذہب اسلام کو اسی بنا پر بے حد نقصان پہنچا ہے۔ لیکن میں ایسے علماء کی دینی راہنمائی کے حق کو تھوڑی دیر کے لیے تسلیم کیے لیتا ہوں۔ آیئے ہم مناظرہ کی خاطر یہ تسلیم کر لیں کہ آیا ''علم'' سے مراد محض وہی علم ہی ہے جو ان علماء کی رائے ہے تو ایسی صورت میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ:

''کیا ہندستان میں ہر مسلم خاتون کو ایسا علم حاصل کرنے کی ترغیب یا اجازت دی جا سکتی ہے؟

کیا ہندستان میں ہر مسلم خاتون کو اس نوعیت کی تعلیم میسر ہے؟

کیا ہندستان میں ہر مسلم خاتون کو سورۃ فاتحہ یا کلمہ یاد ہے؟

کیا ہندستان میں ہر مسلم خاتون کو نماز پڑھنا آتی ہے؟

ہندستان میں کتنی مسلمان خواتین کو ان آیات و احادیث سے واقفیت حاصل ہے جن پر اسلامی برادری میں مسلمان عورت کی حیثیت کا دارومدار ہے؟ آپ سے میری التجا ہے کہ خدارا ان سب مسلم خواتین کو ایسی ہی تعلیم دلوایئے۔ میں اس سے زیادہ کچھ نہیں چاہتا۔ باقی جو کچھ ہے وہ از خود ہو کر رہے گا۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے:

''عورتیں مردوں کا نصف بہتر ہیں''۔

''عورتوں کے حقوق مقدس ہیں۔ خبردار انھیں ان کے وہ حقوق دو جو اللہ تعالیٰ نے انھیں عطا کر رکھے ہیں''۔

کیا ہندستانی مسلمان عورتیں اپنے حقوق کے بارے میں کچھ جانتی بھی ہیں؟

شریعتِ اسلامی میں عورتوں کو مردوں کے ساتھ قانونی مساوات حاصل ہے۔ عورتوں کے

لیے جداگانہ حق ملکیت رکھا گیا ہے اور خاص حالات میں انھیں خُلع یعنی طلاق حاصل کرنے کا اختیار دیا گیا ہے۔ ہندستان میں آج کتنی عورتیں ہیں جو اپنے اس شرعی حق سے آگاہ ہیں؟ اور ہندستان میں آج کون انھیں اس امر کی ضمانت دے سکتا ہے کہ انھیں ان کے حقوق حاصل رہیں؟ بلاشبہ ہندستان میں مسلمان عورتوں کے شرعی حقوق کا آج کوئی محافظ نہیں۔ ہندستان میں اس قاضی عورت کا وجود تلاشِ بسیار کے باوجود بھی کہیں دکھائی نہیں دیتا جو امامِ اعظم ابوحنیفہؒ کی رائے میں ہر شہر میں موجود ہونا چاہیے تاکہ عورتوں کے حقوق سے متعلق مقدمات کا فیصلہ کر سکے۔ وہ قاضی بھی کہاں ہے جس کے پاس عورتیں بغرضِ انصاف اپنی فریادیں اور شکایات لے کر جا سکیں۔ قاضی عورتوں کے حقوق کا نگہبان اور محافظ ہوا کرتا تھا۔ ہندستان میں آج قاضی کی حالت اس کے مذہبی مقام سے اسی درجہ تنزلی کا شکار ہے جیسی کہ مسلمان عورت کی حیثیت اس کے اسلامی معیار سے فروتر ہے اور دونوں کی موجودہ حالتوں کی کوئی معقول وجہ نہیں نظر آتی۔

مرد اور عورت کو اسلامی شریعت نے مساوی حقوق عطا کیے ہیں اور قرآن کریم واشگاف الفاظ میں کہتا ہے کہ اللہ کی نظر میں مرد اور عورت برابر ہیں۔ قرآنِ پاک میں ارشاد خداوندی ہے:

وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى (النساء ۴: ۱۲۴)

عربوں کے زمانۂ جاہلیت میں عورت کو ایک الگ گھٹیا اور پست درجہ کی مخلوق سمجھا جاتا تھا۔ قرآنِ حکیم ایسے لوگوں کو یاد دلاتا ہے کہ وہ ایک ہی نسل سے ہیں اور ایک دوسرے سے یعنی مرد عورت سے اور عورت مرد سے' پیدا ہوتے ہیں۔

پردہ

قرآنِ پاک اور احادیث نبویؐ سے ہرگز یہ ثابت نہیں کیا جا سکتا کہ عورتوں کو تازہ ہوا' روشنی اور صحت بخش مشاغل سے یعنی ان نعمتوں سے جو اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان کے لیے عام کر دی ہیں' محروم کیا جا سکتا ہے۔ شریعت میں عورتوں کے لیے اس حبسِ دوام کا بھی کوئی تصور نہیں جس کی وجہ سے ہزاروں عورتیں ہر سال تپ دق اور

قلتِ خون جیسے موذی امراض کا شکار ہو جاتی ہیں اور یہ اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ ان ناروا پابندیوں کی وجہ سے کتنے ہی بچے ہر سال موت کے منہ میں چلے جاتے ہیں۔ قرآنِ پاک میں شرم و حیا، عفت و شرافت کی تعلیم کی تلقین ضرور موجود ہے۔ لیکن اس میں ایسی بے جا پابندیوں کا کہیں تذکرہ نہیں۔

عربی اور اسلامی روایات یہ تاکید کرتی ہیں کہ عورتوں کو اپنا سر اور گردن ڈھانپنا چاہیے۔ چہرے کو نقاب سے چھپانا اصلاً اسلامی رواج نہ تھا۔ بلکہ طلوع اسلام سے پہلے اس قسم کے پردے کا رواج عرب کے شہروں میں نہیں بلکہ ایشیا کے بہت سے شہروں میں تھا۔ ہندستان کا مروجہ چہرے کا پردہ ابتدائی کئی صدیوں تک مسلمانوں کے تصور و خیال میں بھی نہ آیا تھا۔ انھوں نے یہ پردہ اور بعض دوسرے رواج اس وقت اختیار کیے جب وہ شام، عراق، ایران اور مصر کے شہروں میں پہنچے۔ اس قسم کا پردہ ان ممالک میں پہنچ کر کچھ تو ان ممالک کے رواج کے پیش نظر اختیار کیا گیا اور کچھ اپنی عورتوں کو وہاں کے باشندوں کی بدگمانیوں سے بچانے کے لیے، جن کے نزدیک چہرے کی بے پردگی اور نمایش فحاشی کی علامت ہوتی تھی، بعد میں عرب کے شہروں میں بھی تمدن کی علامت سمجھ کر اختیار کر لیا گیا۔ تمدن کو انگریزی تہذیب کا ہم معنی سمجھا جاتا ہے۔ لیکن عربی میں تمدن میں شہری زندگی کا مفہوم زیادہ قابل قبول ہے۔

اس قسم کے پردے کا رواج مسلمان عورتوں میں کبھی وسیع پیمانے پر نہیں ہوا۔ ان کی اکثریت نے کبھی ایسے پردے کو اختیار نہیں کیا کیونکہ دُنیا میں مسلمان عورتوں کی اکثریت دیہات میں رہتی اور اپنے باپوں، بھائیوں، خاوندوں، بیٹوں کے ساتھ کھیتوں میں کام کرتی ہے۔ ان کے لیے چہرے کا پردہ ایک فضول سی مصیبت ہی ہے۔ چادر البتہ ہر عورت اوڑھنا پسند کرسکتی ہے۔ مصری، شامی، ترکی یا عربی دیہاتی عورتیں نقاب صرف اس وقت ڈالتی ہیں جب وہ شہر کو جاتی تھیں اور وہ بھی گویا کا ناپردہ ہی ہوا کرتا تھا۔ اس کے برعکس جب شہری عورتیں دیہاتی علاقوں میں جاتیں تو وہ چہرے کا پردہ اور اس کے ساتھ ہی وہ تمام ادب آداب بھی ترک کر دیتی تھیں جن کی شہروں میں لازمی پابندی کی

جاتی تھی۔ مجھے ہندستان کے علاوہ کسی ایسے ملک کا علم نہیں جس میں وہ طرائق جو شہروں میں بسنے والے امیر کبیر لوگوں نے ایک زمانے میں برائے حفاظت و شان و شوکت اختیار کیے تھے؟ (اور ایسے لوگوں کے پاس وسیع باغات اور شان دار محل موجود تھے) غریب لوگوں نے اختیار کر لیے ہوں۔ جن کے تنگ و تاریک گھروں میں عورتوں کو مقید کر دینا صریحاً ظلم ہے۔ کمال یہ ہے کہ امیر کبیر مسلمانوں نے بھی ہر جگہ ان طرائق کو اختیار نہیں کیا تھا۔ معروف مورخ عمارہ نے ہمیں بتایا ہے کہ یمنی عربوں میں پانچویں صدی ہجری کے بڑے بڑے خودمختار سرداروں نے اپنے گھروں کی عورتوں کا بے پردہ پھرنا اپنے لیے باعث فخر و اعزاز سمجھا۔ کیونکہ وہ اپنے آپ کو اس حد تک عظیم و باجبروت سمجھتے تھے کہ ان کی عورتوں کی طرف کوئی ٹیڑھی آنکھ سے دیکھنے کی جرأت ہی نہیں کر سکتا تھا۔

یہاں اس حد تک حقیقت ہے کہ اس خاندان نے جو زبیہ پر حکمران تھا اور یمن میں خلیفۂ بنی عباس کا نمایندہ تھا دربارِ بغداد سے عجمی رنگ کی تقلید میں حرم کا رواج اختیار کیا۔ لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ پردے کا طریق اپنی نوعیت کے اعتبار سے نہ عربی ہے نہ اسلامی۔ اس کی ابتدا زرتشتی، عجمی، مسیحی اور بازنطینی ہے۔ اس مروجہ پردے کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں نہ ہی مسلمان عورتوں کی اکثریت نے ایسا پردہ اختیار کیا ہے۔ جب تک پردے کا رواج ذی حیثیت اور بڑے بڑے خاندانوں تک محدود تھا، جنھیں سیر و تفریح اور ورزش کے لیے اپنے وسیع و عریض محلات میں کافی جگہ میسر تھی۔ پردہ عورتوں کے لیے نہ نقصان دہ تھا اور نہ ان پر ظلم و زیادتی کا موجب گنا جاتا تھا اور اسے ایک خصوصی عہد کا رواج سمجھتے ہوئے اسلامی نکتۂ نظر سے ناقابل اعتراض قرار دیا جا سکتا تھا۔ لیکن جونہی پردہ عورتوں کے لیے باعثِ تکلیف و ضرر ثابت ہوا۔ شرعی نقطۂ نظر سے جو عورتوں سے حسنِ سلوک کا متقاضی اور ان کی برتری اور ترقی کا خواہاں ہے، واضح طور پر قابل اعتراض قرار پایا۔ اسلامی معاشرے کے ہر طبقے نے پردے کا رواج نہیں اپنایا۔ ہندستان کی طرح جونہی تمام طبقے اس رواج کو اپنا بیٹھیں گے، ایسے شر اور فتنہ و فساد میں مبتلا ہو جائیں گے جس کی شریعت کبھی متحمل نہیں ہو سکتی۔

ہندستان میں عورتوں کی موجودہ حالت کے مقابلے میں ترکی شام مصر عرب و ایران کی عورتوں کی حالت بہت بہتر اور قابل رشک رہی ہے۔ انھیں ہمیشہ آزادی حاصل رہی ہے۔ ان ممالک میں طبقۂ اوسط سے تعلق رکھنے والی عورتیں نقاب اوڑھے آزادانہ طور پر بازاروں میں جا کر خریداری کرتی اور دوسری عورتوں سے ملاقات کرنے جایا کرتی تھیں۔ اور سچ یہ ہے کہ پردے کے پیچھے عورتوں کی دُنیا مردوں کی دُنیا کی طرح آزاد اور دلچسپ رہی ہے۔ فرق صرف اتنا ہی رہا ہے کہ وہ دُنیا مردوں سے الگ تھلگ اور اپنے طور آزاد رہی ہے۔ نقاب پوش عورتیں گلیوں بازاروں میں ہر طرح سے محفوظ و مامون تھیں۔ ان میں سے کسی بھی عورت کی توہین تمام مسلم آبادی کو مشتعل کر دیتی تھی۔ طبقۂ اوسط کے خاندانوں کی عورتیں اپنی مرضی سے ہر جگہ آ جا سکتی تھیں اور انھیں آپس میں مل بیٹھنے کے مواقع بکثرت میسر تھے۔ مختلف اسلامی ملکوں میں عورتوں کو جو آزادی حاصل ہوئی ہے وہ قانونِ شریعت کی بجائے مقامی روایات اور مقامی رسوم و رواج پر موقوف رہی ہے۔ قانونِ شریعت میں تو عورتوں کے بعض حقوق کی ضمانت دی گئی ہے۔ اور اس امر کا تقاضا کیا گیا ہے کہ عورتوں سے حسن سلوک روا رکھا جائے اور ان کے حقوق کی پاسداری کی جائے۔ عورتوں کے لیے اسلامی قانون سے زیادہ منصفانہ قانون دُنیا میں کہیں نہیں پایا جاتا۔ عربوں اور ترکوں میں اس لحاظ سے کچھ فرق تھا کہ ترکوں نے اکثر بازنطینی رسوم اختیار کر لی تھیں۔ لیکن جو کچھ میں نے عرض کیا ہے اس کا اطلاق دونوں پر ہوتا ہے۔ ہندستان میں عورتوں کی اکثریت جس حالت اور حیثیت سے زندگی گزار رہی ہے اسے کوئی عرب یا ترک عورت قبول نہیں کر سکتی اور نہ ہی یہ ممالک اپنی عورتوں کے لیے ایسی حالت اور حیثیت گوارا کر سکتے ہیں۔

پرانے وقتوں میں ترکی عورتوں کی جو حالت تھی وہ اب یکسر تبدیل ہو چکی ہے۔ اس کی وجہ ایسی دلچسپ ہے کہ میں یہاں اسے بیان کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ جب ترکوں نے پہلی مرتبہ اناطولیہ اور رومیلیا میں قدم رکھے تو اس وقت وہ وسطِ ایشیا کی سانولی رنگت چھدری داڑھیوں اور ترچھی آنکھوں والی قوم تھے۔ ان کے اس ناک نقشے کی تصدیق

ان کے بادشاہوں اور جرنیلوں کی تصویروں سے ہوتی ہے۔ اس قسم کے لوگ آج بھی ادرنہ میں پائے جاتے ہیں۔ لیکن اور کہیں نہیں پائے جاتے۔

سرکیشیا' جارجیا' البانیہ' شام' بلغاریہ' سرویا اور یورپ و ایشیا کی دوسری خوب صورت اور سفید فام اقوام کی عورتوں سے شادیوں کی بدولت ترک اب اتنے سرخ و سفید اور خوب صورت ہیں جتنے کہ انگریز۔ یہ تغیر ترک عورتوں کی بھاری پیمانے پر اموات کا سبب بنا اور تپ دق نے تو ایسی ہلاکت آفرینی دکھائی کہ الامان!

جب تک ترک عورت سانولے رنگ کی تھی روایتی خانم آفندی کی زندگی' جو تن آسانی اور آرام طلبی کی زندگی تھی اس کے لیے تکلیف دہ اور پریشان کن ہرگز نہیں تھی۔ لیکن جب اس کی رنگت میں سفیدی آ گئی تو پردے میں رہنے کے مضرت رساں اثرات عیاں ہونا شروع ہو گئے۔ اگر چہ ترک عورتوں کا پردہ ہندستانی عورتوں کی طرح نہ تھا یعنی اس میں سختی اور شدت نہ تھی۔ پھر بھی چونکہ یہ پردہ تھا اس لیے اسے ضرر رساں قرار دیا جانے لگا۔ ترک ڈاکٹروں نے تحقیق و جستجو کے بعد یہ معلوم کیا کہ سفید رنگت والی عورتیں سانولی رنگت والی عورتوں کے مقابلے میں جسمانی طور پر کمزور ہوتی ہیں اور انھیں زیادہ ورزش اور تازہ ہوا کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب ترکی کے حکمرانوں پر اس حقیقت کا انکشاف ہوا تو وہ عورتوں کی آزادی کے حامی بن گئے اور انھوں نے ان کی بے پردگی کی حوصلہ افزائی کرنی شروع کر دی اور نقاب اور دوسری مضر صحت پابندیاں ختم کر دیں۔

ترکی کی شہری عورت اب ایسا لباس پہنتی ہے جو اس نے دیہات میں پہنا ہے' یعنی باش ارتو یا سر کا صافہ جس کے ساتھ ایک لمبا اور ڈھیلا سا دوپٹہ ہوتا ہے اور ایک لمبا اور کھلا لبادہ جو اسے سر سے پاؤں تک ڈھانپے رکھتا ہے۔ اس لباس میں ایک تو جلوہ گری بھی کم ہوتی ہے اور دوسرے یہ کہ یہ صحت کے لیے ضرر رساں بھی نہیں۔ آج ترک عورتوں کے لیے ورزش اور کھلی فضا میں کھیلنے کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے اور اس مقصد کے لیے ان کے لیے بہت سے کلب بنائے گئے ہیں۔ وہ مردوں کے برابر لیکن ان سے الگ رہتے ہوئے تعلیم حاصل کر رہی ہیں۔ ترک عورتیں آج کل ایسے کاموں میں

مہارت حاصل کر رہی ہیں جو ان کی دادیوں پردادیوں کے وہم و گمان میں بھی نہ آ سکتے تھے جنھیں کرنا وہ باعثِ ہزار شرم و ندامت سمجھتیں۔ لیکن یہ سب کچھ شریعت کی حدود میں رہتے ہوئے ہی ہو رہا ہے۔ حالات کے تغیر نے عورت کے آزادانہ مشاغل کے دائرے میں وسعت پیدا کر کے ان اعمال کو ان کی صحت و مسرت کے لیے لازم اور انتہائی ضروری بنا دیا ہے لیکن یہ تغیرات ترک عورتوں کے لیے ایسے انقلاب انگیز نہیں ہیں کیونکہ ان کے سامنے ہمیشہ دیہاتی ترک عورتوں کی مثال موجود ہوئی ہے جس کی بدولت وہ شہروں کے لباس اور پابندیوں کو شرعی قوانین سے متصادم ہونے سے بچا سکیں۔

ترکی کے دیہاتی واقعی نہایت اچھے مسلمان ہیں۔ اناطولیہ میں دیہاتوں میں اسلامی ضابطۂ شائستگی پر بڑی عمدگی سے عمل ہوتا ہے۔ لیکن ترکی، شام، سرکیشیا، مصر اور عرب کے دیہاتوں اور بدوی قبائل میں عورتوں کو جو آزادی حاصل ہے وہ ایک ہندستانی مُلاّ پر حیرتوں کے پہاڑ توڑنے کے لیے کافی ہے۔

ہندستانی مسلمانوں کی ایک بڑی بدبختی یہ ہے کہ ان میں کاشت کاروں کی کمی ہے۔ وہ اس ملک میں فاتحین کی حیثیت سے داخل ہوئے۔ ان کے خیالات، حوصلے اور اُمنگیں وہی تھے جو اس زمانے کے افغان، ایرانی اور ترکستانی سلاطین کے سینوں میں موجزن تھے۔ لیکن اب ہر ہندستانی مسلمان یہ ضروری سمجھتا ہے کہ اپنی عورتوں کے ساتھ وہی ظالمانہ سلوک روا رکھے جو اصلی مغل یا پٹھان امیر سے اسے ورثے میں ملا ہے۔ اسے اس کی کوئی پرواہ نہیں کہ ایک کال کوٹھڑی میں زندگی بسر کرتے ہوئے اس کی عورت پر کیا گزرتی ہے۔ لیکن عورت سے سلوک کے معاملے میں وہ ان مغل بادشاہوں کی تقلید ضرور کرنا چاہتا ہے جن کی عورتوں کو قلعہ آگرہ کے شان دار اور کھلے زنانہ محلات ملے ہوئے تھے۔

ہندستانی مسلمانوں کو مزارعین کی عدم موجودگی ہی نے پرانے زمانے کے شہری امراء میں رائج پردے کو اسلامی قانون کے مطابق سمجھنے کی تحریک دلائی۔ اگر ہندستان میں مسلمان مزارعین کا ایک ایسا طبقہ موجود ہوتا ہے جیسا کہ عرب، مصر، شام یا اناطولیہ

میں موجود ہے جو ایک قوم کی مضبوط بنیاد کا کام دیتا ہے تو ہندستانی مسلمان کبھی اس گمراہی میں مبتلا نہ ہوتے کہ پردہ ان غربا کے لیے بھی ضروری ہے جو جھونپڑیوں میں رہتے ہیں اور نہ ہی امراء ایسے پردے کو شہروں اور گاؤں میں یکساں طور پر اختیار کرتے۔ کاشتکار عقلِ سلیم سے عاری نہیں ہوتے اور نہ ہی ان میں کسی قسم کی تصنع پائی جاتی ہے۔ ان کے ہاں غلط معیار کی بھی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ ایک کاشتکار مرد اور عورت دونوں کو ان کی کارکردگی، مہارت اور انتظامی قابلیت سے پرکھتا ہے۔ میں نے مصر کے ایک گاؤں میں ایک عورت کو گاؤں کا انتظام و انصرام کرتے پایا۔ وہ عورت بلندئ کردار کے ساتھ ساتھ عقل و فراست اور دُور اندیش اور معاملہ فہمی کی صفات سے بھی متصف تھی اور یہ کوئی غیر معمولی مثال نہیں۔ مصری کاشت کار سچے اور پرجوش مسلمان ہیں۔ وہ شعائرِ اسلامی کی سختی سے پابندی کرتے ہیں اور احکامِ شریعت پر کاربند رہتے ہیں۔

عورت کے مقام اور حیثیت سے متعلق جتنے بھی اسلامی قوانین ہیں۔ وہ عورت کے فائدے کے لیے ہی ہیں۔ ان ہی میں اس کی بہتری و بھلائی ہے۔ اس کی صحت و مسرت، اس کی معاشی و معاشرتی فلاح و بہبود ان کا مقصود ہے۔ یہ کوئی بے جان و ساکت قوانین نہیں بلکہ متحرک و رواں ہیں۔ حالات میں تغیر و تبدل کے ساتھ ساتھ ان میں بھی تغیر و تبدل پیدا ہوتا ہے۔ وہ کسی صورت میں کسی ایسے رواج کی تائید نہیں کر سکتے جو عورت کے لیے نقصان دہ اور ایذا رساں ثابت ہو۔ پردے کا طریق اسلامی قانون کا حصہ نہیں بلکہ یہ ایک ایسا درباری رواج یا فیشن ہے جو اس زمانے میں اختیار کیا گیا جب عجمی اور بازنطینی اثرات کی بدولت خلافت اصل اسلامی معیار سے گر کر محض ایک ایشیائی بادشاہت بن کر رہ گئی تھی۔ پردہ مسلمانوں میں ان رواجوں میں سے ایک ہے جو ان کے لیے باعث تقویت نہیں بلکہ باعث کمزوری ثابت ہوئے تھے۔ اسلام کی قوت اور احیاء کا سرچشمہ ہمیشہ دہقان کا کھیت، لوہار کی بھٹی، چرواہے کا جھونپڑا اور خانہ بدوش کا خیمہ رہا ہے۔ انھی سرچشموں سے درباروں کو نئی قوت حاصل ہوئی ہے۔ مسلمانوں کو پردہ کو رواج دینے اور اس کی حوصلہ افزائی کرنے والوں سے کوئی عزت و قوت حاصل نہیں ہوئی۔

ہمارے لیے یہ بہتر اور ضروری ہے کہ ایک عظمتِ گم گشتہ کی یہ علامت مٹ جائے۔ اگر ہندستان کے مسلمان غریب اور نادار ہیں اور انھیں پیٹ پالنے اور تن ڈھانکنے کے لیے محنت و مشقت اختیار کرنی ہے تو انھیں کاشت کاری کو ذریعہ معاش بنانے میں کوئی شرم و ہچکچاہٹ محسوس نہ کرنی چاہیے کیونکہ زراعت اسلام کے نزدیک ایک باعزت و محترم پیشہ ہے۔

درحقیقت کوئی بھی ایسا ملک جس کے کاشت کار مسلمان نہ ہوں' اسلامی ملک کہلانے کا حق دار نہیں۔ جہاں کہیں مسلمان اس طرح رہ رہے ہیں کہ ان میں کاشت کاروں کا کوئی وجود نہیں تو ان کی زندگی ایسے پھول دار پودوں جیسی ہے جن کی جڑیں نہ ہوں اور وہ زمین سے غذا اور قوت حاصل کرنے سے محروم ہوں۔

میں کوئی فوری اور بڑا تغیر نہیں چاہتا۔ آپ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد مبارک کے مطابق اپنی عورتوں کو زیور تعلیم سے آراستہ کیجیے۔ اس طرح زمانۂ حال کے تقاضوں کے پیش نظر آپ خود دیکھ لیں گے کہ ہمارا مروج طریقۂ حجاب ختم ہو جائے گا۔ آج کل جو چیز پردہ کہلاتی ہے اسے اسلامی اصولوں سے دُور کا واسطہ بھی نہیں۔ اگر آپ مردوں اور عورتوں کو اصلی اور صحیح اسلامی تعلیمات سے بہرہ ور کریں گے تو اسلامی قواعد و ضوابط اس تبدیلی و تغیر سے روبہ انحطاط و تنزل نہ ہوں گے بلکہ تقویت و ثبات پائیں گے۔

شریعت عورت کے لیے سراپا شفقت و رحمت ہے۔ اس کی تعلیم و ترقی کی حامی ہے۔ لیکن وہ ان سے یہ ہرگز نہیں چاہتی کہ وہ مردوں میں گھلیں ملیں۔ ڈاکٹر ہیری کیمبل نے لندن انسٹی ٹیوٹ آف ہائی جین میں کچھ عرصہ ریسرچ ورک کرنے کے بعد اپنے مقالہ میں تحریر کیا تھا کہ:

''عورتوں کے پھیپھڑے مردوں کے مقابلے میں چھوٹے ہوتے ہیں۔ ان میں خون کی شریانیں بھی زیادہ نہیں ہوتیں۔ ان میں زندگی کی آگ مردوں کی طرح اتنی تیزی سے نہیں سلگتی۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عورتیں مردوں جیسی شدید محنت و

مشقت کی زندگی گزارنے کی جسمانی طور پر اہل نہیں ہیں۔ احساسات میں عورتیں مردوں سے مختلف ہیں۔ لیکن دماغی صلاحیت کے اعتبار سے دونوں تقریباً ایک ہی سطح پر ہیں۔ مردوں میں جہاں ذہانت کی کمی نہیں وہاں حماقت کی کمی بھی نہیں"۔

عورتوں اور مردوں میں جس طرح دماغی اور روحانی مساوات اور جسمانی تفاوت ہے۔ بعینہٖ اسلامی قانون اسے تسلیم کرتا ہے۔ شریعت میں عورت کے مرتبے سے متعلق عیسائیت میں مدتوں سے پھیلے ہوئے غلط خیالات کی تائید کرنے کی کوئی چیز موجود نہیں ہے۔

غیر مسلم اعتراض کرتے ہیں کہ مسلمان اپنی عورتوں سے جانوروں جیسا سلوک کرتے ہیں اور مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ عورت ایک بے روح مخلوق ہے۔ اس غلط فہمی کا حقیقی سبب جو ہندستان میں دیکھا جا سکتا ہے' ہمارا بلند اسلامی معیار سے گر جانا ہے۔

بلاشبہ یہ سچ ہے کہ عورت سے متعلق مغربی نظریہ اور مسئلہ مرد و زن بعض اعتبارات سے اسلامی نقطۂ نظر سے یکسر مختلف ہے۔ لیکن اس اختلاف کی نوعیت اگر ایک طرف ایسی نہیں جیسا کہ اہل مغرب کا خیال ہے تو دوسری طرف ایسی بھی نہیں جیسی کہ اکثر مسلمانوں کے افعال سے ایک سطحی نظر سے دیکھنے والے کے ذہن میں پیدا ہوتی ہے۔ ہم اپنی نادانی سے احکامِ شریعت کی خلاف ورزی کے مرتکب ہوتے ہوئے دُنیا کے سامنے اسلام کا کوئی اچھا نمونہ پیش نہیں کرتے۔ کوئی مسلمان دیدہ و دانستہ شرعی قوانین کی خلاف ورزی کا مرتکب ہونا پسند نہیں کرتا۔ لیکن ہمارے عمل کی شہادت ہمارے نزدیک ایک باطل شہادت ہے۔ ہمارے اعمال کی اس باطل شہادت ہی نے ہمارے دین کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا ہے۔ ہندستان کے مسلمانوں کی اکثریت اس حقیقت سے قطعاً لاعلم معلوم ہوتی ہے کہ اسلام نے مرد و زن کے تعلقات کے بارے میں ایک ایسا نظام اور مطمعٔ نظر پیش کیا ہے جو یورپ کے مہذب ترین لوگوں کے نظام اور مطمعٔ نظر کا مقابلہ کر سکتا ہے۔

ہندستان کے مسلمان غیر اسلامی اور ظالمانہ رسوم کی محبت میں گرفتار ہیں۔ اسے عورت کی مغربی آزادی کے جواب میں ایک عاجزانہ اعتراف شکست کہا جا سکتا ہے۔

شادی

اسلامی نکاح عورت کو کنیز بنا دینے والا مذہبی قانون نہیں بلکہ یہ ایک ایسا سول معاہدہ ہے جو مساویانہ حیثیت رکھنے والے فریقین (مرد و عورت) میں سے کسی کی مرضی سے فسخ ہو سکتا ہے۔ اس آئین کے ابتدائی زمانے میں زیادہ مستحکم اسباب کی بنا پر، جن کی اہمیت آج بھی برابر قائم ہے، مرد کے لیے عورت کے مقابلے میں اس معاہدے کی تنسیخ میں زیادہ سہولت رکھی گئی ہے۔ میں نے جو کچھ سنا ہے اگر وہ سچ ہے تو مجھے یہ اعلان کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں کہ ہندستان کے اکثر مسلمانوں نے عورتوں کے بارے میں ہندوؤں کے خیالات کو قبول کر لیا ہے۔ مثلاً شادی، نکاحِ بیوگان اور وراثت سے متعلق--- میں دوبارہ یہ امر آپ کو ذہن نشین کرانا چاہتا ہوں کہ شریعتِ اسلامی کی خلاف ورزی بلاخوفِ تعزیر نہیں کی جا سکتی۔ اور یہ کہ قوانینِ شریعت بدلتے زمانے کی ضروریات کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ ان میں معقول اطلاق کی صلاحیت موجود ہے۔ یہ قوانین راہِ راست کی طرف رہنمائی کرتے ہیں اور ان حدود کا تعین کرتے ہیں جن کا قائم رکھنا ضروری ہے۔ وہ اس راستہ پر ڈال دیتے ہیں جس پر چلنا لازمی ہے۔ لیکن ہر زمانے میں ان کی تفاصیل اور جزئیات اسی رہنمائی کی روشنی اور حالات کے تقاضوں سے طے کرنی ہوتی ہیں۔ اسلام درحقیقت انسانی ترقی کا مذہب ہے۔ یہ کبھی بھی انسانی دل و دماغ کی نشوونما کو روک دینے اور پستی اور ذلت مسلط کر دینے والے حالات کا حامی اور ظلم و غلامی کو فروغ دینے کی تائید نہیں کر سکتا۔ اسلام ترقی انصاف اور آزادی کا پیغام ہے۔

کہا گیا ہے کہ اسلام میں عورت کی حیثیت کا نظریہ مردوں کا نظریہ ہے اور عیسائیت میں عورت کی حیثیت خود نسوانی نقطۂ نظر ہی ہے۔ دراصل عیسائی دُنیا میں ہمیشہ مردوں کی حکمرانی رہی ہے۔ اس لیے عیسائی نقطۂ نظر کبھی عمل پذیر نہیں ہوا۔ اس میں بے شمار اُلجھنیں پیدا ہوئی ہیں اور بلحاظِ عمل اس میں گوناگوں تضادات رہے ہیں۔ مسیحی مذہبی زعما اسلامی نظریہ کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ لگانے سے قاصر ہیں۔ وہ اسلام کو

ایشیائی عورت کی معاشرتی اور اخلاقی زبوں حالی اور پستی و ذلت کا ذمہ دار قرار دیتے ہیں لیکن وہ درحقیقت یہ بھول جاتے ہیں کہ عیسائی دُنیا میں عورتوں کی ایک قلیل تعداد ایسی قعرِمذلت میں گری ہوئی ہے کہ مسلمان اس کے تصور سے کانپ اٹھتا ہے۔ ان عیسائی عورتوں کی اکثریت اپنے فطری حقوق سے محروم کر دی گئی ہے اور مسلمانوں کے نزدیک یہ ایک بہت بڑا ظلم ہے۔

اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تاریخِ عالم میں عورتوں کے حقوق کے سب سے بڑے علم بردار ہیں۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عورت کو ذلت کی انتہائی پستیوں سے نکال کر ان رفعتوں تک پہنچا دیا جو مسیحی دُنیا کے خیال و گمان میں بھی نہیں آ سکتیں۔ ظہور قدسی کے وقت اہل عرب عورت کو انتہائی گھٹیا اور ذلیل مخلوق سمجھتے تھے۔ اس سے وہ انتہائی بدسلوکی روا رکھتے تھے۔ اسے دھوکا اور فریب دیتے تھے۔ اس سے انتہائی نفرت وحقارت سے پیش آتے تھے۔ قرآنِ پاک میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

يَٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا ۭ وَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ لِتَذْهَبُوْا بِبَعْضِ مَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ۚ وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا ۝ (النساء ۴:۱۹)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو تمہارے لیے یہ حلال نہیں ہے کہ زبردستی عورتوں کے وارث بن بیٹھو اور نہ یہ حلال ہے کہ انھیں تنگ کر کے اس مہر کا کچھ حصہ اڑا لینے کی کوشش کرو جو تم انھیں دے چکے ہو۔ ہاں اگر وہ کسی صریح بدچلنی کی مرتکب ہوں تو (ضرور تمھیں تنگ کرنے کا حق ہے)۔ ان کے ساتھ بھلے طریقے سے زندگی بسر کرو۔ اگر وہ تمھیں ناپسند ہوں تو ہو سکتا ہے کہ ایک چیز تمھیں پسند نہ ہو مگر اللہ نے اس میں بہت کچھ بھلائی رکھ دی ہو۔

ایامِ جاہلیت میں عرب لڑکی کے پیدا ہونے کو ایک ذلت اور خواری سمجھتے تھے۔

جن لڑکیوں کی کوئی ضرورت نہ سمجھی جاتی تھی انھیں زندہ درگور کر دیا جاتا تھا۔ قرآنِ حکیم نے سختی سے اس فعلِ بد کا قلع قمع کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی ایسی رسومات کی بھی بیخ کنی کر دی جو اس سے کسی صورت میں کم ظالمانہ یا منصفانہ نہ تھیں۔ قرآنِ حکیم عورت کو ایک خاص معزز و محترم مقام عطا کرتا ہے اور بنی نوع انسان کو اس سے عزت و احترام خلوص و مروت سے پیش آنے کا حکم دیتا ہے۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

- ''عورتیں مردوں کا نصف بہتر ہیں''۔
- ''جب عورت نماز پنجگانہ ادا کرتی ہے' رمضان کے روزے رکھتی ہے۔ باحیا اور پاک دامن ہے۔ خاوند کی اطاعت گزار ہے تو اسے کہہ دو کہ وہ جنت میں جس دروازے سے چاہے داخل ہو جائے''۔
- ''جنت ماں کے قدموں تلے ہے''۔
- ''عورتوں کے حقوق مقدس ہیں۔ اس بات کا خصوصی خیال رکھو کہ عورتوں کو ان کے حقوق حاصل رہیں''۔
- ''جو شخص لڑکیوں کی خدمت کرے گا۔ دوزخ کی آگ اس پر حرام ہوگی۔ جو شخص دو بیٹیوں کے ان کی بلوغت تک خدمت و نگہداشت کرے گا وہ اگلے جہاں میں میرے ساتھ اس طرح ہوگا جیسے ہاتھ کی دو انگلیاں ہوتی ہیں''۔
- ''طلاق اللہ تعالیٰ کے نزدیک جائز امور میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ ہے''۔
- ''کیا میں تم کو یہ نہ بتاؤں کہ افضل ترین نیکی کیا ہے؟ وہ یہ ہے کہ جب تمہاری بیٹی اپنے خاوند سے طلاق لے کر تمہارے پاس آئے تو اس سے حسن سلوک کرو''۔
- ''جس کے ہاں کوئی لڑکی ہو اور وہ اس کو زندہ نہ گاڑے' نہ اسے ملامت

کرے، نہ اس کے مقابلے میں دوسرے بچوں سے بہتر سلوک کرے تو اللہ تعالیٰ ایسے شخص کو داخل جنت کرے گا''۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتی تعلیمات عورتوں کے حقوق کی پاس داری اور ان کے ساتھ حسن سلوک کی ہدایت پر مبنی ہیں۔

ارشاد نبویؐ ہے: ''تم میں سے بہترین انسان وہ ہے جس کا سلوک اپنی بیوی کے ساتھ عمدہ ہے''۔

آنحضورؐ کی زندگی میں عورتوں پر لطف و کرم کی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔ رحمت اللعالمینؐ نے اس عورت کو بھی معاف فرما دیا تھا جس نے آپؐ کی دعوت کی اور آپؐ کے کھانے میں زہر ملا دیا تھا جس کے اثر سے آپؐ کے ایک صحابیؓ فوت ہو گئے اور خود آپ بھی ایک نہایت تکلیف دہ اور عود کر آنے والی بیماری میں مبتلا ہو گئے اور بالآخر اسی سے انتقال فرمایا۔ قرآن پاک نے خود عملی مشکلات کی عدم موجودگی میں سیکڑوں مرتبہ عفو اور درگزر کو انتقام اور سزا سے بہتر قرار دیا ہے۔ اگر عفو اور درگزر سیاسی طور پر انسانیت کے خلاف خود ایک جرم نہیں بن جاتے اور اگر مردوں اور عورتوں پر انفرادی طور پر اس کے مثبت اثرات ظاہر ہوتے ہیں اور ان کے دلوں سے نفرتیں اور کدورتیں دُور ہو جاتی ہیں تو ان کا (عفو و درگزر) استعمال صحیح ہے۔ بصورت دیگر یہ ایک برائی بن کر سوسائٹی پر مسلط ہوتے چلے جائیں گے۔

مسلمانوں میں عورت کے مقام کے بارے میں مغرب میں اس قدر غلط بیانی سے کام لیا گیا ہے کہ یورپ اور امریکہ میں اب تک لوگوں کا یہ خیال ہے کہ مسلمان عوتوں کو انسان ہی نہیں سمجھتے۔ قرآن پاک نے جہاں تک اللہ سے ان کا تعلق ہے مسلمان مردوں اور عورتوں میں کوئی امتیاز نہیں برتا۔ دونوں کے لیے نیکی اور بدی کی ایک جیسی سزا ہے۔

اِنَّ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ وَالْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ وَالْقٰنِتِیْنَ وَالْقٰنِتٰتِ وَالصّٰدِقِیْنَ وَالصّٰدِقٰتِ وَالصّٰبِرِیْنَ وَالصّٰبِرٰتِ وَالْخٰشِعِیْنَ وَالْخٰشِعٰتِ

وَالْمُتَصَدِّقِيْنَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ وَالصَّآئِمِيْنَ الصّٰٓئِمٰتِ وَالْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ وَالذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ ۙ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا ○ (الاحزاب ۳۳: ۳۵)

بالیقین جو مرد اور عورتیں مسلم ہیں' مومن ہیں' مطیع فرمان ہیں' راست باز ہیں' صابر ہیں' اللہ کے آگے جھکنے والے ہیں' صدقہ دینے والے ہیں' روزہ رکھنے والے ہیں' اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں اور اللہ کو کثرت سے یاد کرنے والے ہیں۔ اللہ نے ان کے لیے مغفرت اور بہت بڑا اجر مہیا کر رکھا ہے۔

مسلمان عورتوں اور مردوں کے باہمی تعلقات میں ایک امتیاز یعنی اختلاف وظائف کو واقعی موجود ہے' تسلیم کیا گیا ہے۔ ایک ایسی آیت مبارکہ میں جو ایامِ جاہلیت کے عربوں کو جو عورتوں کو تمام حقوق سے محروم رکھتے تھے' متحیر کر دے گی' ارشاد باری تعالیٰ موجود ہے:

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِىْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۠ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ○ (البقرہ ۲: ۲۲۸)

عورتوں کے بھی معروف طریقے پر ویسے ہی حقوق ہیں جیسے مردوں کے حقوق ان پر ہیں۔ البتہ مردوں کو ان پر ایک درجہ حاصل ہے اور سب پر اللہ غالب اقتدار رکھنے والا اور حکیم و دانا موجود ہے۔

نکاحِ بیوگان

عرب میں ظہورِ اسلام سے پہلے بیواؤں کی حالت بے حد افسوس ناک اور قابل رحم تھی۔ قرآن پاک نے بیواؤں کے نکاح کو جائز قرار دیا۔ عورت کو ایک مرد سے طلاق لے کر دوسری شادی کرنے کا حق عطا کیا۔ اس طرح شادی کو جو درحقیقت عورت کو مرد کی کنیز بنا دیتی تھی ایک دیوانی معاہدہ کی حیثیت بخشی ہے۔ جسے فریقین اپنی صوابدید سے منسوخ کر سکتے ہیں۔ اس حق تنسیخ پر چند پابندیاں ہیں' جو قدرتی اسباب کے سبب عورت

پر کافی سخت ہیں۔ یہ پابندیاں اور حدود اس لیے عائد اور متعین کی گئی ہیں کہ فریقین ایک دوسرے سے الگ ہونے سے پہلے اچھی طرح غور کر لیں۔ اسی طرح خاوند یعنی ایک فریق معاہدے کے انتقال پر معاہدہ از خود ختم ہو جاتا ہے۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود متعدد بیواؤں سے شادی کی تاکہ ایک طرف تو عربوں میں موجود بیواؤں سے نفرت کا جذبہ ختم ہو جائے۔ دوسری طرف حکمران کی حیثیت سے آنحضرتؐ پر بیواؤں کی گزربسر کی جو ذمہ داری ہے وہ بھی ایک طرح سے پوری ہو سکے۔

تعدادِ ازدواج

اب میں مسلمانوں میں تعداد ازدواج کے مسئلہ کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔ ظہورِ اسلام سے قبل عربوں میں تعداد ازدواج کی کوئی پابندی نہ تھی۔ مرد و زن کے تعلقات پر بھی کوئی قانونی یا مذہبی پابندیاں عاید نہ تھیں۔ اسلام نے ایسی پابندیاں اور حدود مقرر کر کے معاشرے میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔ مغربی مصنفین شریعت اسلامی پر ایک بڑا اعتراض یہ کرتے ہیں کہ اس میں مرد کو صرف ایک ہی بیوی پر قناعت کرنے کا واضح اور صریح حکم نہیں دیا گیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام پیامِ رحمت سے ہی اسی لیے انحراف کیا جاتا ہے کہ آپ کی بیویوں کی تعداد ایک سے زائد تھی۔ اس سلسلے میں' میں جواباً عرض کروں گا کہ تاریخِ عالم یک زوجگی کی ایسی درخشاں مثال پیش کرنے سے قاصر ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت خدیجہؓ کی چھبیس سالہ رفاقت پیش کرتی ہے۔ یہ رفاقت عدیم المثال تھی اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ پُرمسرت شادیاں مستثنیات سے ہوتی ہیں۔ اگر آنحضرتؐ کا تجربہ وہیں تک محدود ہوتا تو نوعِ انسانی کے لیے آپؐ کی مثال کا افادہ اس اعتبار سے قلیل ہوتا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی میں ایک بیوی اور متعدد بیویوں کے ساتھ شادی کا بہترین نمونہ ہمارے سامنے پیش کیا ہے اور یہ نہایت بہتر ہی ہوا کیونکہ اس زمانے میں مردوں کی اکثریت کثیر الازدواجی پر عمل پیرا تھی اور میں سمجھتا ہوں کہ اس

طریق پر عمل آج تک جاری ہے۔

بعض اوقات لوگ تعداد ازدواج کو اسلام کا ایک مسلک قرار دے دیتے ہیں۔ تعدادِ ازدواج شعائرِ اسلامی میں سے اسی طرح نہیں ہے جیسا کہ یہ شعائر عیسائیت میں سے نہیں۔ یہ ایک انسانی کمزوری ہے جسے مرد و عورت بلکہ زیادہ تر عورت کے مفاد میں ایک ضابطہ کے اندر لانے کی ضرورت ہے۔ مغربی ممالک میں یک زوجگی پر کبھی عمل تو ہوا نہیں بلکہ یک زوجگی کی آڑ میں بے شمار عورتوں اور ان کے بچوں پر نہایت بھیانک مظالم توڑے گئے ہیں۔ اسلام تمام فرسودہ ضابطوں کو کالعدم قرار دیتا ہے۔ ایسے فرسودہ ضابطوں نے انسانوں کی کثیر تعداد کو اپنے جائز حقوق اور مرتبے سے محروم کر رکھا ہے۔ یورپ میں جہاں عورت کو انتہائی معزز و محترم مقام عطا کیا گیا ہے وہاں اس کی ظالمانہ حد تک تذلیل وتحقیر بھی کی جاتی ہے۔

تعدادِ ازدواج کے اسلامی نظام پر اگر پوری طرح عمل پیرا ہوا جائے تو اغوا کے خطرات' عصمت فروشی اور دوسری بے شمار بے انصافیوں اور مظالم کا بھی خاتمہ ہو جاتا ہے جو یورپ میں عورتوں کو تعدادِ ازدواج کی زبانی مخالفت کی بنا پر سہنے پڑتے ہیں۔ اسلامی نظام کا بنیادی اصول یہ ہے کہ ہر مرد ہر عورت کی طرف اپنی توجہ اور اس کے نتائج کا ذمہ دار ہے۔

نظامِ شریعت اگر مغربی مصنفین کی مرد عورت کے جنسی تعلقات پر آباد تخیلاتی و روحانی دُنیا کو برباد کر دیتا ہے تو یہ کوئی قابل اعتراض بات نہیں۔ موجودہ مغربی لٹریچر میں اگر عورت کا مقام تلاش کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ مرد کی زندگی کا اعلیٰ ترین مقصد عورت کی محبت ہے اور نصب العین یہ ہے کہ وہ ایک ہی عورت ہے جسے وہ کئی عورتوں کو برتنے کے بعد چنتا ہے۔ جب وہ عورت مل جاتی ہے تو سمجھا جاتا ہے کہ "روحوں کا ملاپ" عمل میں آ گیا ہے اور یہی مقصدِ حیات ہے۔ کیا اسے عقل و ہوش اور حقیقت کہنا چاہیے' یہ تو نری جہالت اور حماقت ہے۔ اس خیال کا سرچشمہ شاید عیسائیت ہی کی تعلیم ہے۔ وہاں عورت فطرتاً گناہ گار اور دھتکاری ہوئی مخلوق ہے۔ جسے صرف کسی پادری کی دعا ہی

انسانوں کے لیے قابل قبول اور محترم بنا سکتی ہے۔

اسلام کی تعلیم اس سے یکسر مختلف ہے۔ یہاں شادی روحوں کے ملاپ کا نام نہیں۔ باہمی ہمدردی اور تھوڑی بہت محبت تو بلاشبہ ممکن ہے۔ لیکن ہر انسانی روح جھولے سے قبر تک اکیلی ہی ہوتی ہے۔ جب تک کہ اسے خدا تک پہنچانے کا کوئی وسیلہ میسر نہ آ جائے۔ ہر انسان کی روح دوسرے انسانوں کی روحوں سے الگ اور آزاد ہے۔ ہر روح اپنے اعمال کی خود جواب دہ ہے۔ ہر روح کو اپنا بوجھ خود ہی اٹھانا ہوتا ہے اور دُنیا کے ہجومِ آلام و فرائض میں اپنا راستہ خود ہی تلاش کرنا ہوتا ہے۔ اس باب میں مرد و عورت میں کوئی فرق نہیں۔ شادی کی صورت میں ان کی روحوں کے ایک دوسرے میں ضم ہو جانے کا کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا۔ ہر روح علیحدہ اور آزاد رہتی ہے۔ میاں بیوی تو ایک دوسرے سے متعلق بعض فرائض کی انجام دہی کے لیے ایک معاہدہ کے تحت متحد ہوئے ہیں۔ یہ معاہدہ باہمی محبت، عزت و احترام اور جذبہ رفاقت سے مقدس و مستقل بنایا جا سکتا ہے۔ اگر فریقین کے درمیان افہام و تفہیم، محبت و خلوص اور جذباتی ہم آہنگی نہ ہو تو اس معاہدے کو منسوخ کر دینا ہی بہتر ہے۔ شادی کوئی ناقابل فہم آسمانی صحیفہ نہیں۔ یہ تو اللہ کے ایک آزاد بندے اور آزاد بندی کے درمیان ایک قسم کا دیوانی (سول) معاہدہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے میاں بیوی کے درمیان باہمی محبت کا حکم دیا ہے۔ ان میں سے ایک کے حقوق دوسرے پر صاف صاف معین کر دیے ہیں اور ان پر شائستگی اور وقار کے چند قوانین کی پابندی لازم کر دی ہے۔ اگر ان کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے باہمی محبت اور جذبۂ رفاقت پیدا نہیں ہوتا اور انھیں خوف ہے کہ وہ شرعی حدودِ معینہ پر کاربند نہ رہ سکیں گے تو یہ معاہدہ ختم ہو جانا چاہیے۔

یک زوجگی اور کثیر الازدواجی دونوں صورتوں میں عورت اپنا مکمل وجود، آزادئ رائے، آزادئ عمل، ملکیت جائیداد اور نام کو بحال و برقرار رکھتی ہے اور دوسری بیویوں کی موجودگی میں الگ رہائش کا مطالبہ بھی کر سکتی ہے۔ اس لیے عورت کو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ سوسائٹی کا عمل یک زوجگی پر ہے یا کثیر الازدواجی پر۔

کثیر الازدواجی پر یورپ کے نیم مذہبی حلقوں کا اعتراض اس وجہ سے ہے کہ ان میں شادی کو ایک ناقابل تنسیخ اور اٹل آسمانی فیصلہ تصور کیا جاتا ہے۔ ان لوگوں کے خیال میں شادی مرد و عورت کے ایک ایسے اتحاد کا نام ہے جس میں عورت اپنی شخصیت و شناخت گم کر بیٹھتی ہے۔ مرد کے لیے ایک ہی بیوی رکھنا اب بھی اسلام کا مطمعِ نظر ہے۔ لیکن یہ صرف مطمعِ نظر ہی ہے' درحقیقت بعض اوقات یک زوج شادی خانگی عدم اطمینان وسکون کا سبب بن جاتی ہے اور خطرناک قسم کی معاشرتی برائیوں کو جنم دینے کا باعث بھی بن جاتی ہے۔ اسلامی قانون کا مقصد شادی کو انسان کے لیے سرمایۂ راحت و مسرت بنانا ہے۔ اس لیے اس نے انسانی کمزوریوں سے صرفِ نظر نہ کرتے ہوئے ایسی صورت میں جب شادی مسرت وسکون کی بجائے اذیت و تکلیف کا باعث بن جائے' طلاق کی اجازت دے رکھی ہے۔ یورپی ممالک میں پہلے تو طلاق کا کہیں نام ونشان نہ تھا۔ اب انصاف و معقولیت کی بنا پر یورپ کے بیشتر ممالک میں طلاق کو قانونی طور پر جائز قرار دے دیا گیا ہے۔ لیکن ان ممالک میں طلاق اہتمام اور بہتان تراشیوں کی انتہائی درجہ ناشائستہ اور ناروا تشہیر کے سبب ایک مستقل معاشرتی عذاب بن کر رہ گئی ہے۔ لیکن اسلامی رویۂ طلاق ایسی خرابیوں سے پاک ہے۔ میں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ مسلمانوں میں پرمسرت اور کامیاب شادیاں یورپ والوں سے کم نہیں ہوتیں۔ مرد کے لیے ایک سے زاید بیویاں کرنا اسلام کا کوئی قانون نہیں بلکہ یہ انسانی فطرت کے لیے ایک رعایت عطا کی گئی ہے۔ قرآنِ پاک کثیر الازدواجی کا ہرگز حکم نہیں دیتا۔ بلکہ بعض خاص قسم کے حالات میں عورتوں کو بے یارومددگار اور بے سہارا چھوڑ دینے کی ممانعت کرتے ہوئے ان کے لیے بہتر حالات مہیا کرنے کی سفارش کرتا ہے۔ کثیر الازدواجی کی اجازت قرآنِ پاک کی مذکورہ صدر آیات میں موجود ہے۔ جن کا نزول اس وقت ہوا جب مسلمانوں کی قلیل جماعت میں ۱۰ فی صد مرد شہید ہو چکے تھے اور جب بہت سی عورتیں اپنی گود میں شیرخوار بچے لیے قید ہو کر آئی تھیں۔

وَاٰتُوا الْيَتٰمٰۤى اَمْوَالَهُمْ وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيْثَ بِالطَّيِّبِ ۠ وَلَا تَاْكُلُوْٓا

اَمْوَالَهُمْ اِلٰۤی اَمْوَالِكُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا كَبِیْرًا ○ وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰی وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۚ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُكُمْ ؕ ذٰلِكَ اَدْنٰۤی اَلَّا تَعُوْلُوْا ○ وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً ؕ فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَیْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِیْٓـًٔا مَّرِیْٓـًٔا ○ (النساء ۴: ۲-۴)

یتیموں کے مال واپس دو' اچھے مال کو برے مال سے نہ بدل لو اور ان کے مال اپنے مال کے ساتھ ملا کر نہ کھا جاؤ۔ یہ بہت بڑا گناہ ہے اور اگر تم یتیموں کے ساتھ بے انصافی کرنے سے ڈرتے ہو تو جو عورتیں تم کو پسند آئیں ان میں سے دو دو تین تین چار چار سے نکاح کر لو۔ لیکن اگر تمھیں اندیشہ ہو کہ تم ان کے ساتھ عدل نہ کر سکو گے تو پھر ایک ہی بیوی کرو یا ان عورتوں کو زوجیت میں لاؤ جو تمھارے قبضہ میں آئی ہیں۔ ناانصافی سے بچنے کے لیے یہ زیادہ قرین صواب ہے اور عورتوں کے مہر خوش دلی سے ادا کرو۔ البتہ اگر وہ خود اپنی خوشی سے مہر کا کوئی حصہ تمھیں معاف کر دیں تو تم اسے مزے سے کھا سکتے ہو۔

ان آیات کو ان خیالات سے' جن کا اظہار عالم اسلام میں کثیر الازدواجی پر کم ہی عمل درآمد ہو رہا ہے۔ لیکن اس کی اجازت اس حقیقت کی شہادت دیتی ہے کہ شادی مرد و عورت کے لیے وضع کی گئی ہے۔ مرد و عورت شادی کی خاطر نہیں بنائے گئے۔

اسلام نے مرد کو ہر عورت کے ساتھ اپنے طرز عمل کے لیے ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔ ذمہ داری' شرم و حیاء' پاک دامنی و عفت اسلامی اخلاقیات کی بنیاد ہیں۔ انھی کی بدولت وہ آزادی جس کے ساتھ انسانی فلاح اور امن و چین وابستہ ہے' نصیب ہو سکتی ہے۔ یورپ کی بے راہ روی جس آزادی تک لے جاتی ہے وہ مسلمانوں کی نظر میں اخلاق و شائستگی کی تمام حدیں پھلانگ چکی ہے۔

اب آپ مردوں اور عورتوں کے باہمی اختلاط کے متنازعہ فیہ مسئلے کی طرف آئیے۔ اگر یہ سچ ہے اور تجربہ اس کا سچا گواہ ہے' یورپ اور امریکہ میں عورتوں کے حقوق

کے علم بردار یہ اعلان کرتے نہیں تھکتے کہ عورتوں اور مردوں کی دلچسپیاں جدا جدا ہیں۔ عورتیں اپنی روز مرہ کی زندگی میں اپنی ہم جنسوں کے درمیان زیادہ خوش رہتی ہیں اور مردوں کی غلامی کے جوئے تلے رہنے کے بجائے ایک آزاد مخلوق کی طرح ترقی کی اہل ہیں تو پھر وہ اسلامی طریق جس کی رُو سے عورت اپنے دائرے میں خود مختار ہے فطرتِ انسانی کے عین مطابق ہے۔

اسلامی طریق میں افزائش نسل کی رعایت مدنظر رکھی گئی ہے۔ عورت اور اس کے خاوند اور عورت اور اس کے دوسرے قریبی رشتہ داروں کے مابین رشتے کی حرمت و تقدس وہی ہے جو مغرب میں ہے۔ لیکن عورت کی معاشرتی زندگی کا دائرہ خود اس کی ہم جنسوں تک ہی محدود ہے۔ اسلامی طریق میں مردوں اور عورتوں کے مخلوط غسل' مخلوط ناچ گانے اور باہم محبت و معاشقہ کا کوئی تصور نہیں' نہ اس کی اجازت ہے۔ اسلام کی اصل تعلیمات کے تحت عورت کے لیے ترقی کے امکانات لامحدود ہیں۔

عورتوں کے لیے عورتیں ہی وکیل' ڈاکٹر' سائنس دان' جج اور علماے دینیات ہو سکتی ہیں اور ایسا کرنے کے لیے کوئی سچا مسلمان ان پر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد گرامی کی مطابقت اور اطاعت میں ان پر حصولِ علم کی راہیں بند نہیں کر سکتا۔ لیکن انسانی ترقی کے لیے اگر اس میدان ہی کی سیر مقصود ہو تو ایسی صورت میں بھی مغرب کی اندھا دھند تقلید سے کام نہیں نکل سکتا۔ کیونکہ عورت کی آزادی کے مغربی تصور اور مسلمانوں کے نقطۂ نظر میں بعد المشرقین ہے۔

مغربی عورتوں کو حال ہی میں شادی شدہ عورتوں کے حقوقِ جایداد جیسے معمولی قانونی حقوق کے لیے انتہائی سخت قسم کی جدوجہد کرنی پڑی ہے۔ ایسے حقوق اسلام نے عورتوں کو روزِ اول ہی سے عطا کر رکھے ہیں۔ مغربی عورتوں کو بڑی محنت اور جدوجہد کے بعد مغربی مردوں کو یہ سمجھانے میں کامیابی حاصل ہوئی ہے کہ عورتوں کی دلچسپیاں مردوں کی دلچسپیوں سے مختلف ہیں۔ شریعتِ اسلامی نے اس حقیقت کا بہت پہلے ہی سے کامل اعتراف کیا ہے۔

مغرب میں عورتوں کو اپنے قانونی اور دیوانی (سول) حقوق کو تسلیم کروانے کے سلسلے میں بڑی دوڑ دھوپ اور جانگسل محنت کرنی پڑی۔ جبکہ اسلام نے ان کے حقوق کو شروع ہی سے تسلیم کر رکھا ہے۔ اب ان کی اپنی باپردہ انجمنیں ہیں اور یہ بڑے بڑے اسلامی ملکوں میں موجود رہی ہیں۔ مغربی عورتوں اور مسلمان عورتوں کی حیثیت میں اور حصول حقوق کی جدوجہد میں بڑا فرق ہے۔ اسلام میں مردوں نے عورتوں کے حقوق کو بلاچوں و چرا تسلیم کیا اور اگر حالات کے تقاضوں کے تحت ان حقوق کی کسی صورت میں توسیع کی ضرورت پیش آئے تو شرعی منشاء و مقصود کے پیش نظر وہ عورتوں کے ایسے حقوق تسلیم کرنے سے گریز نہیں کریں گے۔ مسلمان عورتوں کی آزادی پسندی مرد و عورت میں جنگ و جدل کی صورت نہیں اختیار نہیں کر سکتی۔ لہٰذا مسلمان عورت اور مغربی عورت کی حیثیت میں درحقیقت کوئی مماثلت نہیں ہے''۔

شادی کے اسلامی طریق پر بسا اوقات یہ اعتراض بھی کیا جاتا ہے کہ لڑکی کو اپنے لیے خاوند کے انتخاب کا حق حاصل نہیں بلکہ اسے اس سلسلے میں اپنے والدین کی مرضی پر سر جھکانا پڑتا ہے۔ درحقیقت یہ طریق صرف مسلمانوں میں ہی نہیں بلکہ مغربی ممالک میں بھی زیر عمل ہے۔ اقوامِ عالم میں کون اس حقیقت سے انکار کر سکتا ہے کہ جب کوئی نوعمر لڑکی اپنے لیے ایک ایسا شوہر منتخب کرتی ہے جس پر اس کے والدین کو اعتراض ہے تو وہ لڑکی اپنے لیے ایک بڑی مصیبت مول لے رہی ہے۔ اس کے برعکس مسلمان والدین اپنی لڑکی کو اس کے نزدیک ناپسندیدہ قرار دیے جانے والے مرد کے ساتھ شادی کرنے پر مجبور نہ کریں گے۔

ترکی میں' جہاں بالغ لڑکیوں کے لیے محرم مردوں کا حلقہ اتنا وسیع کر دیا گیا ہے کہ شادی کے قابل لڑکے بھی اس میں داخل ہو گئے ہیں' میرے ایک دوست کی بیٹی نے اپنے باپ سے کہا کہ وہ فلاں پاشا سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ باپ نے کہا: ''ٹھیک ہے لیکن تم اس بات کو خوب اچھی طرح سے ذہن نشین کر لو کہ جب تم ایک قدیم رواج کی خلاف ورزی کی مرتکب ہو گی تو وہ تمام رسوم خود بخود ختم ہو جائیں گی جو اس رواج سے

وابستہ رہی ہیں۔ اگر تم فلاں پاشا سے شادی کرنا چاہتی ہو جو میری رائے میں کوئی اچھا آدمی نہیں ہے' کیونکہ میں تمہاری نسبت اس سے زیادہ اچھی طرح سے واقف ہوں' تو اس شادی کی ناکامی اور طلاق کی صورت میں میرے گھر کے دروازے تم پر ہرگز کھلے ہوئے نہیں رہنے چاہیں۔ اگر تم شادی کے سلسلے میں میری پسند کو قبول کر لو تو قانون اور رواج کے تحت تمہاری ازدواجی زندگی کی تباہی کی صورت میں میں تمہیں اپنے سایۂ عافیت میں لے لوں گا۔ میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔ تم اپنا راستہ خود منتخب کر لو۔ اس پر لڑکی اپنے پسندیدہ پاشا سے شادی کے ارادے سے باز آ گئی اور اس نے اپنے باپ کے تجربے اور علم کو شوہر کے انتخاب میں اپنے لیے بہتر سمجھا۔

جب مسلمان عورتوں کی آزادی پر بحث وفکر کریں تو انہیں اسلامی نصب العین پیش نظر رکھنا چاہیے۔ ورنہ وہ کبھی کسی واضح اور صحیح منزل پر نہ پہنچ سکیں گے اور تاریکیوں میں اندھوں کی طرح اپنا راستہ ٹٹولتے پھریں گے۔ ہمیں ہرگز نہ بھولنا چاہیے کہ شریعت کے قوانین ساکت و جامد نہیں ہیں (یہ بات میں ایک بار پھر بڑے اصرار سے کہہ رہا ہوں) بلکہ یہ ہر زمانے میں زندگی کی ضروریات کا ساتھ دینے والے ہیں۔ شریعت ان قواعد سے جو بعد کے زمانوں میں وضع کر لیے گئے ہیں' بالاتر ہے۔ اور یہ کہ عورتوں کے حقوق ان کی ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ مردوں کی طرح عورتوں کے لیے بھی اسلام کا قانونِ عدل ہے۔ اسلام کا نصب العین بنی نوعَ انسان کی عالم گیر اخوت ہے۔ نوع انسان میں مردوں کی طرح عورتیں بھی شامل ہیں اور اسلام اس متعین کردہ منزل تک رسائی اس وقت تک ناممکن ہی رہے گی جب تک عورت کی حیثیت وہی ہے جو آج مشرق ومغرب میں دکھائی دیتی ہے جسے ہم نے جبراً اس پر مسلط کر رکھا ہے۔

○○○

خطبۂ ہشتم

اللہ اور رسولؐ کی حکمرانی یعنی اسلامی حکومت

اب تک میں آپ لوگوں کو ماضی کی داستانیں سناتا رہا ہوں۔ اب اپنے اس اختتامی خطبے میں، میں اپنی توجہ عہدِ حاضر کی طرف مبذول کرتا ہوں۔ میں دکھا چکا ہوں کہ انسانی عمل و ارتباط کے کسی شعبے میں اسلام کا معیار عہدِ حاضر کے اعلیٰ ترین معیارات سے تطابق رکھتا ہے لیکن افسوس! خود مسلمان کا اپنا عمل اس بلند معیار کے لیے باعث ندامت بن رہا ہے۔ میں اسلامی سلطنت کی سیاسی قوت کے زوال اور اسلامی تہذیب کی تنزلی و انحطاط کے اسباب اپنی بصیرت کے مطابق آپ کی خدمت میں عرض کر چکا ہوں۔ میں نے یہ بھی عرض کیا ہے کہ اس زوال اور انحطاط نے اپنی شریعت پر مسلمانوں کے ایمان کو کمزور کرنے کے بجائے اسے اور بھی مضبوط و مستحکم کر دیا ہے۔ کیونکہ اب انہیں یہ واضح طور پر دکھائی دے رہا ہے کہ ان کی ذلت و خواری کا سبب احکامِ شریعت سے رُوگردانی کے سوا کچھ نہیں۔ یہاں آپ چند احادیث نبویؐ سن لیجیے:

۱- تعلیم حاصل کرنا ہر مسلم مرد اور عورت پر فرض ہے۔

۲- علم حاصل کرو چاہے چین جانا پڑے۔

۳- خدا کی مخلوق کے مطالعے اور غور و فکر میں صرف کیا ہوا ایک دن سال بھر کی عبادتوں سے افضل ہے۔

۴- پہلے اُونٹ کے پاؤں باندھو، پھر توکل کرو۔

احکامِ شریعت سے رُوگردانی کرنے والوں پر عیاں ہو چکا ہے کہ ان کی زبوں

حالی واقعی شرعی احکام سے انحراف کرنے ہی کا نتیجہ ہے۔ مسلمانوں کو آج صاف نظر آ رہا ہے کہ مغربی اقوام کی اقتصادی خوش حالی اسلامی شریعت کے ان احکام کی متابعت کا نتیجہ ہے جو مادی ترقی اور معاشی مرفوع الحالی کے ضامن ہیں اور جنھیں مسلمانوں نے اپنی حماقت سے اپنے دورِ انحطاط میں پس پشت ڈال دیا تھا۔ اہلِ مغرب نے شریعتِ اسلامی کے ایسے اصولوں کو جن سے عیسائیت اس وقت آگاہ نہ تھی (جب اس کی باگ ڈور کلیسا کے ہاتھ میں تھی) قبول کرلیا۔ تدبر' فکری آزادی' مذہبی رواداری' قانون اور معاشرہ میں کسی انسان کی حیثیت کا اس کے عقائد' حسب ونسب اور اس کی دولت نہیں بلکہ اس کے تقویٰ سے متعین ہونا' قانون کی نظر میں مرد و زن کی کامل مساوات' عورت کے حق ملکیت کا اعتراف' خلع اور عقدثانی' جسمانی طہارت' امتناع منشیات' شریعتِ اسلامی کے یہ تمام اجزائے حسنہ جو عیسائی یورپ میں مذہباً قابل لعنت قرار دیے ہوئے تھے اور جنھیں کلیسا تاحال لامذہبیت کی علامت اور خارج از دین اور محض دُنیوی قرار دیتا ہے' آج مغربی تہذیب کے اجزائے ہیئت بن چکے ہیں اور اس میں جمع کر دیے گئے ہیں۔ یہ ثابت کیا جا سکتا ہے اور خود عیسائی مصنفین ہی نے ثابت کر دکھایا ہے کہ یہ افکار نو اور نظامِ جدید انہوں نے پہلے زمانے کے مسلمانوں ہی سے حاصل کیا۔ ایک فرق البتہ ضرور ہے۔ اہل مغرب نے ان خیالات وعقائد کو دلیلِ شرعی سے نہیں بلکہ دلیلِ عقلی سے پایا ہے۔ لیکن مسلمانوں نے انہیں ابتداء دلیل شرعی کی بنیاد پر اختیار کیا۔ مسلمان پہلے تو ان عقائد پر اللہ کے حکم کے مطابق ایمان لائے۔ پھر انھوں نے ان کے لیے عقلی دلائل تلاش کرنے شروع کر دیے۔ یہ قرین قیاس ہے کہ یورپ جس نے ان احکام کو شروع ہی سے عقلی دلائل کی بنا پر قبول کیا ہے' مآل کار ان کے من جانب اللہ ہونے پر ایمان لے آئے۔ مجھے تو ذاتی طور پر اس کی اس وقت تک اُمید نہیں ہے جب تک اہل مغرب منشائے ربانی پر ایمان نہ لے آئیں جس پر عقلِ انسانی کا دارومدار ہے۔ جب تک اہل مغرب کو یہ نہ معلوم ہو جائے کہ یہ تمام امور جو دینی نہیں دنیوی ہیں لیکن جن پر انسانیت کی فلاح کا بڑی حد تک دارومدار ہے' موجودہ ضابطۂ مذہب کا صرف ایک جزو ہیں۔

جن کا مخزن وحیٔ الٰہی ہے' اور جب تک ان میں شریعت کے دوسرے حصے کی ضرورت کا احساس (جسے مسلمان مضبوطی سے تھامے ہوئے ہیں) پیدا نہ ہو لے اور یہی حصہ سیاسی ترقی اور معاشرتی استحکام کا ضامن ہے۔ مسلمانوں نے تو اس حصے کو دلیلِ شرعی کی بنا پر دو تین صدیوں سے مضبوطی سے تھاما ہوا ہے۔ لیکن غیر مسلم اسے صرف دلیلِ عقلی کی بنا پر قبول کر سکتے ہیں لیکن افسوس کا مقام ہے کہ دلیلِ عقلی کو جس شکل میں مادہ پرست دُنیا قبول کر سکتی ہے اس میں اسلامی ریاست قبول نہیں کر سکتی۔

اخوت

مسلمان اپنے بعض کارنامے آج بھی پیش کر سکتے ہیں۔ اخوت اسلامی ہی کو لیجیے۔ مسلمان آج بھی دُنیا میں ایک عظیم الشان' فقید المثال اور وسیع ترین انسانی برادری ہیں۔ اسلامی برادری اس حسد و رقابت و باطنی نزاع سے پاک ہے جو مغربی معاشرے کے وجود کے لیے ایک مستقل خطرہ بنا رہتا ہے۔ مسلمانوں کے پاس ایک عمل پذیر بین الاقوامی قانون موجود ہے۔ مسلمانوں کے پاس ایک ایسا معاشرتی ضابطہ موجود ہے جس میں محنت و سرمایہ' زمین دار اور مزارع کے حقوق' حقوقِ املاک و تنظیم بلکہ ملوکیت' دستوریت' اشتراکیت' جمہوریت اور سرمایہ داری کے نظریات کو بڑے سلیقے کے ساتھ جمع کر دیا گیا ہے۔ اگر آج مسلمان اسلامی نظریۂ حیات کی عملی موافقت میں ایک ترقی پذیر اور کامیاب مملکت کی مثال پیش نہیں کر سکتے اور اگر مسلمان اقوام مادی ترقی کی دوڑ میں مغرب سے بہت پیچھے رہ گئی ہیں تو مسلمانوں کے لیے یہ مقامِ حیرت نہیں ہونا چاہیے کہ اگر اہل مغرب یہ سمجھنے لگیں کہ ایسی پس ماندہ اور ناکام قوموں کا ضابطۂ حیات خود ان قوموں کے ضابطۂ حیات کے مقابلے میں انتہائی پست درجہ کی چیز ہے۔ آج ہماری حالت کے پیش نظر انھیں یہ نتیجہ اخذ کرنے میں کیا چیز مانع ہو سکتی ہے؟ اگر اسلام کی روشنی ان تک نہیں پہنچی تو اس میں ان کا نہیں ہمارا قصور ہے۔

دوسرا امر جس نے مسلمانوں کے اپنی شریعتِ حق پر ایمان کو دوبارہ مضبوط و مستحکم کیا ہے وہ مغربی تہذیب کی علومِ طبعی میں محیر العقول کامیابیوں کے باوجود سیاسی اور

معاشرتی علوم میں ایسے مسائل حل کرنے میں ناکامی ہے جن کا حل اسلام نے آج سے صدیوں پہلے پیش کر دیا تھا۔ ہم سب اس امر پر متفق ہیں کہ حقائق اسلام کی اشاعت ہونی چاہیے' اور جہاں تک ممکن ہو جدید دُنیا کو انھیں اختیار و قبول کرنے کی ترغیب دینی چاہیے۔ لیکن ہم میں سے بعض کا خیال ہے کہ اسلامی اصولوں کو دُنیا کے سامنے پیش کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ شریعت کو تو ایک پرانی اور ردّی چیز سمجھ کر خیر باد کہہ دیا جائے اور اسلام کو ایک ایسے مذہب کی حیثیت سے پیش کیا جائے جو اپنا کوئی ضابطۂ حیات نہیں رکھتا۔ اور دُنیا سے یہ کہا جائے کہ اسلام محض ایک ذاتی عقیدے' ایک اندازِ فکر اور ایک خاص رائے کا نام ہے۔ اکثر مسلمان عہدِ جدید کی محیر العقول ترقی سے مرعوب ہو کر مغرب کے طبعی علوم اور کارناموں کو ہی قبول نہیں کرتے بلکہ وہ مغرب کے سماجی و سیاسی نصب العین کو بھی قبول کرنے کو تیار ہیں۔ بلاشبہ مسلمانوں کو مغرب کے طبعی علوم کی اشد ضرورت ہے کیونکہ ان کے حصول کے بغیر احکامِ شرعی کی متابعت مدتوں سے تشنۂ تکمیل ہے لیکن جیسا کہ سعد حلیم پاشا نے اپنی مایۂ ناز کتاب ''اسلام شسمق'' میں مسلمانوں کو اس کے بارے میں متنبہ کیا ہے کہ یہ تو ایک دیوانہ پن یا خودکشی کا مظاہرہ ہے۔ مغرب کے علومِ طبعی کی ترقی ہر چند کہ صحیح طریقے پر ہوئی ہے لیکن اس کے سماجی اور سیاسی نظام کی نشوونما اُلجھے ہوئے اور پیچیدہ طریقے سے ہوئی ہے۔ مغرب کے سیاسی اور سماجی نظام کی بنیادیں قابلِ مشاہدہ حقائق پر نہیں بلکہ ناقابلِ قبول مفروضات پر قائم ہوئی ہیں۔ مغربی نظامِ زندگی صرف انگریزوں کی عام عقل' بے کار اور فضول باتوں کو عملاً کامیاب بنا دینے کی قدرتی صلاحیت' ان کی اعلیٰ دماغی صلاحیتوں اور ان کی آب و ہوا کی عمدگی پر موقوف ہے ورنہ ان کے ملک میں بھی یہ نظام اسی طرح اپنی موت آپ مر چکا ہوتا جیسا کہ فرانس' روس اور اٹلی میں اس کا جنازہ نکل چکا ہے۔ اگر شریعتِ اسلامی کے بعض احکام کی خلاف ورزی کے سبب مسلمان پستی اور تنزلی کا شکار ہو رہے ہیں تو اس سے شریعت کے دوسرے حصوں سے روگردانی کی معقولیت کیسے لازم آتی ہے؟ بلکہ اسی وجہ سے ہم پر یہ فرض اور بھی سختی سے عائد ہوتا ہے کہ شریعتِ اسلامیہ کو اس کی گم شدہ حیثیت دوبارہ

حاصل ہو اور ہم خلوصِ قلب سے اس کی متابعت پر کمربستہ ہو جائیں۔ اس وقت ہمیں اسلام کے اصول و احکام کے ایک واضح ضابطے کی ضرورت ہے جو ہر مسلم مرد عورت کو عطا کیا جا سکے۔ فقہ کی موجودہ کتابوں میں ہمیں یہ افسوس ناک فروگذاشت نظر آتی ہے کہ ذاتی امور مثلاً نماز میں قیام کی صورت کو ممانعتِ قتل جیسے اصولوں کے برابر درجہ دیا گیا ہے۔ ہمیں ان چیزوں میں جو ابدی اہمیت رکھتی ہیں اور ان میں جن کا رواج کسی خاص زمانے میں خاص حالات کے تحت ہو' تمیز کرنا سیکھ لینا چاہیے۔ ورنہ ہم میں سے بہت سے لوگوں کی حالت ایسے جاہلوں جیسی ہوگی جو ظاہر کو باطن سے تمیز نہیں کر سکتے اور اس طرح اصولوں کو پس پشت ڈالتے ہوئے فروعات کے گورکھ دھندوں میں اُلجھ کر منزلِ مقصود تک پہنچنے کے بجائے راستے کے نشیب و فراز اور پیچ و خم میں گم ہو کر رہ جاتے ہیں۔ مسلمانوں کو یورپ سے علومِ طبعی ضرور سیکھنے ہیں لیکن سیاسیات اور عمرانیات میں یورپ آج بھی ان کا استاد ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ ان میدانوں میں اسلام نے تیرہ صدیاں قبل ہی امن و سلامتی کی وہ راہ تلاش کر لی تھی جسے پانے کے لیے عیسائیت آج تک بھٹک رہی ہے۔ اس لیے ہمیں جو مہم درپیش ہے وہ اسلامی ادارات کو چھوڑ کر مغربی ادارات کا اختیار کرنا نہیں بلکہ ایسے جدید ادارات کو اسلامی خدوخال میں ڈھال کر ان کی کارگزاری کے معیار کو موجودہ عہد کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنا ہے۔

شہزادہ سعد حلیم پاشا کو' جن سے میری دوستی ہوگئی تھی' اہم اور نازک دوروں میں سیاسیات کا عملی تجربہ حاصل تھا۔ وہ یورپ کی جدید سیاسیات کے ماہر تھے۔ ایک مصلح اور ناصح تھے جنھیں اپنے خاص منصب اور حیثیت کے تقاضوں کے پیش نظر اسلام اور مسلمانوں کے مستقبل سے تعلق رکھنے والے مسائل پر غور و فکر کا موقع ملا۔ انھیں ایک طرف تو مغرب میں جرمنی' برطانیہ اور فرانس کے افکار کا علم تھا تو دوسری طرف قرآن و سنت پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔ ان اہم صفات کی بدولت وہ عالمِ اسلام کے لیے ایک جدید مسلک تجویز کرنے کے ہر طرح سے اہل تھے۔ ان کا مشورہ مغربیت کو قبول کرنا نہیں بلکہ 'اسلامیت' کو قبول کرنا تھا۔ ان کے پیش نظر ایک آزاد اسلامی ملک تھا جسے ایک

اسلامی سلطنت کا وقار و عظمت اب تک حاصل تھی اور وہ ملک مرکز خلافت بھی تھا۔ انجمن اتحاد و ترقی کے بیشتر اراکین کی طرح وہ بھی خلافت کے حامی تھے۔ لہٰذا ان کا مقصدِ اوّلین ایک حقیقی اسلامی سلطنت کا جدید حالات میں ڈھانچہ تشکیل دینا اور موجودہ مملکتوں سے اس کا مقابلہ کرنا تھا۔ ایسے مسائل ہندستانی مسلمانوں کے لیے فوری اہمیت نہیں رکھتے جیسی کہ وہ ترکوں کے لیے رکھتے ہیں لیکن وہ ہم سب کے لیے ایسے پرکشش ہیں کہ میں ہندستانی مسلمانوں کے اہم اور فوری مسائل سے قبل' جو میرے گذشتہ خطبات سے متعلق ہیں' ان کا خلاصہ پیش کروں گا اور حسبِ ضرورت اپنی تقریظات پیش کرتا جاؤں گا۔ شہزادہ سعد حلیم پاشا کو اپنے کام میں ایسی مشکلات کا سامنا تھا جو ہمیں درپیش نہیں کیونکہ اسلامی حکومت کے اس نظریے کو جو خلفائے راشدین کے زمانے میں زیرِعمل تھا موجودہ عہد کے نظریہ و عمل کے ساتھ ہم آہنگ کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ خلفائے راشدین اگرچہ ایک بے حد وسیع و عریض اور عظیم الشان سلطنت کے حکمران تھے اور تمام ملکوں میں ان کی افواج اور ان کے حکام ان کے احکامات کی تعمیل کو اپنے لیے سرمایۂ نجات سمجھتے تھے لیکن اس کے باوجود ان میں مطلق العنان حکمرانوں جیسی کوئی بات نہ تھی۔ فوجی اور سول آمروں جیسی کوئی بات تو ان میں سرے سے ہی موجود نہ تھی۔ وہ مدینہ طیبہ میں انتہائی سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ ان کے احکامات تمام مسلمانوں کے لیے واجب تعمیل ہوتے تھے۔ لیکن افواج اور مفتوحہ علاقوں کے انتظام و انصرام کے ذمہ دار عہدے داروں کے سوا یہ خلفاء کبھی احکامات صادر نہ کرتے تھے۔ وہ ہر نماز جمعہ کے بعد مسجد نبویؐ میں حالاتِ حاضرہ پر تبصرہ کرتے اور اپنے انتظامی امور کا خطبے میں ذکر کیا کرتے تھے۔ مذہب' قانون اور حکومت کے معاملے میں مسلمان انھی سے رجوع کیا کرتے تھے۔ انھوں نے اپنے لیے کبھی شاہانہ شان و شوکت پسند نہ کی۔ نہ شاہانہ دربار آراستہ کرنا پسند کیا۔ ان کے تعلقات اہل مدینہ اور دوسرے مسلمانوں سے جو ان سے ملنے کے لیے آتے تھے' بالکل بے تکلفانہ اور برادرانہ تھے۔

ایک مرتبہ ایک غریب بڑھیا نے حضرت عمرؓ بن الخطاب سے ناانصافی کی شکایت

کی۔ لوگوں نے اسے ہٹانا چاہا لیکن خلیفۂ اسلام نے کہا: ''اسے بولنے دو۔ ہر مسلمان مرد و عورت کو سچی بات (حاکم کے روبرو) کہنے کا حق حاصل ہے''۔ اس زمانے میں سب مسلمان قوانینِ شریعت سے بخوبی آگاہ تھے اور دل و جان سے ان پر عمل کرنے کو تیار رہتے تھے۔ اگر انھیں کسی امر میں شک پڑ جاتا تو وہ خلیفہ یا اس کے نمایندے کے پاس جاتے تھے جو نہایت سادہ طریقے سے ان کے شکوک و ابہام کو دُور کر دیتے تھے۔ پولیس کا وجود نہ تھا کیونکہ اس کی ضرورت نہ تھی۔ عوام کو ہر طرح سے آزادی حاصل تھی اور ان کے ادارے خودمختار مضبوط و محکم تھے۔ خلفائے وقت عوام کے حقوق کا خاص خیال رکھتے تھے۔

حضرت امیر معاویہؓ کے خلافت کے بجائے ملوکیت اختیار کر لینے پر ایک تغیر رونما ہوا لیکن یہ اتنا زبردست اور شدید نہ تھا جتنا کہ عام طور پر اسے ظاہر کیا جاتا ہے۔ کیونکہ انتخاب کے اصول کا قدرتی نظام برقرار تھا۔ معاویہ ثانی نے بسترِ مرگ پر مسلمانوں کو اس کی سختی سے ہدایت کی کہ وہ اس کے بعد کسی انتہائی نیک و صالح اور بہترین مسلمان کو اس کا جانشین منتخب کر لیں۔ اس وقت تک عربوں کی سادگی بھی ایک حد تک قائم تھی۔ اگر بنی اُمیہ نے معاویہ ثانی کی وفات کے بعد تختِ خلافت سے دست برداری اختیار کرتے ہوئے اپنی صداقت و راستی کا ثبوت دیا ہوتا' (اور ہمیں یہ فراموش نہ کرنا چاہیے کہ انھیں مصر' شام' شمالی عرب اور شمالی افریقہ میں اکثریت حاصل تھی اور اس طرح وہ جو کچھ چاہتے کر سکتے تھے) اور اگر وہ صحیح اسلامی طریقے پر مسلمانوں میں سے بہترین آدمی کا انتخاب کرتے تو باوجود ان جرائم کے جو ان سے اپنے لیے تخت و تاج کے حصول میں سرزد ہوئے' آج تمام مسلمان ان کی اسلامی خدمات کا اعتراف کرتے۔ لیکن انھوں نے خلافت کو اپنے خاندان کے لیے حاصل و مخصوص کرنے کے لیے بے پناہ خون خرابہ کیا۔ سُنّی مسلمانوں کے نزدیک ایسا کرنا خود پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات سے رُوگردانی تھی۔ اُمویوں نے موروثی بادشاہت کی بنیاد ڈالی اور اس طرح ہمارے لیے ایک خالص اسلامی مملکت کے خدوخال مٹا دیے۔ اقبالؒ نے صحیح کہا کہ:

''خلافت برمقام ما گواہی است
حرام است آنچہ بر ما پادشاہی است
غلام فقر آں گیتی پناہم
کہ درنیش ملوکیت حرام است''

اس زمانے سے خلافتِ اسلامیہ مختلف خاندانوں میں گردش کرتی رہی ہے یہاں تک کہ حال ہی میں عثمانی ترکوں کے آخری کمزور اور برائے نام خلیفہ کی ایک لمحہ کے نوٹس پر ترکی سے جلاوطنی عمل میں آئی ہے۔ خلفاء کی لمبی چوڑی فہرست میں بہت سے نیک اور صالح مسلمان بھی دکھائی دیتے ہیں جن کے عہد میں اسلام اپنی حقیقی شان و شوکت کے ساتھ پھیلا کیونکہ ان کے لیے شرعی قوانین مشعلِ راہ ہوتے تھے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ذاتی رواج و ترقی کے جذبہ کے لیے جو حدیں مقرر کی ہوئی ہیں ان سے ایک حکمران اس وقت تجاوز کر گیا جب اس نے خلافت کو موروثی ملوکیت میں بدل دیا اور خالص حکومت الٰہیہ کے ایک تحفظ کو ختم کر دیا۔ اگر ایک خاص نوعیت کی انتخابی حکومت آزاد مقامی ادارات اور اختیارات کے ساتھ (جس پر میں بعد میں بحث کروں گا) اب تک قائم رہتی اور آنے والی صدیوں کی ضروریات کے ساتھ ساتھ وسعت پذیر ہوتی رہتی تو موجودہ عہد کی ضروریات سے ہم آہنگ ایک اسلامی مملکت کی تعمیر مقابلتاً آسان ہوتی۔ اس کے لیے چند ہی اصلاحات کی ضرورت پیش آتی۔ موجودہ زمانے میں قدیم زمانے سے تعلق قائم کرنے کی کوشش آسمان پر تھگلی لگانے سے کم نہیں۔ لیکن سعد حلیم پاشا نے ہماری خاطر یہ مہم انجام دینے کی بہترین کوشش کی ہے۔ یہاں میں ان کے خیالات کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔

آج کل مغرب میں ملکوں کی حکومت دو قسم کے افراد کے لیے مخصوص ہے۔ ایک تو وہ لوگ ہیں جن کی بادشاہتیں موروثی ہیں۔ وہ بڑے اطمینان سے حق وراثت کے تحت تختِ شاہی پر متمکن ہو جاتے ہیں خواہ ان میں حکمرانی کے فرائض انجام دینے کی اہلیت ہو یا نہ ہو۔ دوسرے وہ لوگ ہیں جنھیں عوام اپنے ووٹوں سے حکمرانی کے لیے منتخب کرتے

ہیں۔ اس جمہوری طریقۂ انتخاب کو ہمارا مذہب ناپسند نہیں کرتا بشرطیکہ انتخاب ایمان دارانہ طریقے سے اور ہر لحاظ سے بہترین شخص کا کیا جائے جو یا تو کچھ عرصہ کے لیے یا عمر بھر کے لیے اپنے عہدے پر کام کرتا رہے مغربی جمہوریت اس سے یکسر مختلف چیز ہے۔ اس میں رائے دہی کا حق ایک ایسے انبوہ کثیر کو دے دیا جاتا ہے جو صحیح فیصلہ کرنے کی صلاحیت سے محروم ہوتا ہے اور ایسے لوگوں کا انتخاب عمل میں آتا ہے جو کسی طور بھی اپنے منصب کے اہل نہیں ہوتے۔ حکومت حاصل کرنے کی کوشش وہ لوگ کرتے ہیں جنھیں ہوسِ اقتدار بے چین کیے رکھتی ہے۔ انھیں ملک وقوم کی خدمت سے کوئی غرض نہیں ہوتی۔ قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں میں ایسی کوئی برائی موجود نہیں تھی۔ وہ اقتدار کے لالچی کو قابل نفرت گردانتے تھے۔ آپ لوگ یہ ہرگز نہ سمجھیں کہ یہ پرانا اسلامی نصب العین کہ اقتدار واختیار ہمارے رسولؐ کی طرح ایسے لوگوں کو پیش کرنا چاہیے جنھیں اس کی ہوس نہ ہو اور وہ نیک اور صالح لوگ ہوں' موجودہ زمانے کے مسلمانوں کی نظروں سے اوجھل ہو گیا ہے۔ میں آپ سے عرض کروں گا کہ موجودہ عہد کی تجدیدِ اسلام کی سب سے بڑی تحریک میں اس نصب العین کو مذہبی خدوخال میں مکمل طور پر ملحوظ رکھا گیا۔ ترکی کی انجمن اتحاد وترقی کے دستور میں ذاتی ترقی اور جاہ پسندی کا جذبہ رکھنے والے لوگوں کو نچلے درجے میں رکھا گیا۔ انتظامی اقتدارِ اعلیٰ ان لوگوں کے لیے مخصوص تھا جو قطعاً عوام کے سامنے نہیں آتے تھے اور ظاہری اقتدار ان لوگوں کے لیے تھا جو عوام کے نزدیک جانے پہچانے تو تھے لیکن اقتدار واختیار کی ذمہ داریوں سے گریزاں اور ظاہری شان و شوکت اور ٹھاٹ باٹ سے نفرت کرتے تھے۔ پہلے محمود شوکت پاشا کو پھر سعد حلیم پاشا کو ایسے مناصب کے لیے منتخب کیا گیا۔

مشرقی عالم اسلام میں آپ دیکھیں گے کہ وہ حکمران جو آج منتخب ہوئے ہیں وہی ہیں جنھوں نے اپنی قوموں کے لیے گراں قدر خدمات انجام دی ہیں' وہ لوگ نہیں ہیں جنھوں نے ایک عارضی اکثریت کے زور سے مخالف پارٹی کو زیر کر دیا ہو۔ ایسے انتخابات جن میں آپس میں مقابلہ ہو' جو جانی دشمنی کی حد تک جا پہنچتا ہو۔ اسلامی طریقۂ

انتخاب میں پورے نہیں اُترتے کیونکہ اسلام ایسی جماعتوں کو صالحین کی جماعت تسلیم نہیں کرتا جن کے اراکین انفرادی طور پر نااہل ہوں۔ جاہلوں کا انبوہِ کثیر اس کے نزدیک ہرگز قابل اعتماد نہیں۔

حکمران کے انتخاب کا مسئلہ واقعی بہت مشکل ہے۔ مسلمانوں میں اس انتخاب کی ذمہ داری ایسے دانش مند اور ذی فہم لوگوں کو تفویض کی گئی ہے جو متعلقہ اشخاص یعنی امیدواروں سے بخوبی واقف ہوں۔ مسلمانوں کی اکثریت کو بحیثیت ایک جماعت اس انتخاب میں کچھ دخل حاصل نہیں۔ وہ تو اس انتخاب کو یا قبول کرتے ہیں یا مسترد کر دیتے ہیں۔ اسلامی مملکت کا حکمران ایک مدتِ معینہ کے لیے نہیں بلکہ زندگی بھر کے لیے چنا جاتا ہے۔ اسے حکومت کے تمام اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔ جہاں تک عوام سے اس کا تعلق ہے وہ ایک کلی اختیارات رکھنے والا حکمران ہے لیکن جہاں تک شریعت کا تعلق ہے وہ اپنی رعایا کے ادنیٰ سے ادنیٰ فرد سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ وہ سب مسلمانوں کی طرح ایک عام سا مسلمان ہے۔ اسے روزِ قیامت کا خوف رہتا ہے جب اسے اللہ تعالیٰ کے حضور اپنے تمام اعمال کی جواب دہی کرنی ہوگی۔ جب تک وہ صراطِ مستقیم پر ہے، لوگ اسے معزول نہیں کر سکتے۔ اگر وہ صراط مستقیم سے بھٹک جائے تو شریعت لوگوں کو اس کے محاسبہ اور مواخذہ کا حق عطا کرتی ہے۔ ضرورت پڑنے پر اسے معزول بھی کیا جاسکتا ہے۔

مغربی جمہوری ملکوں میں عوام حکمران کو اس کی راست روی کے جرم میں بھی معزول کر سکتے ہیں بلکہ اسے کسی درست اقدام پر محض اس لیے بھی معزول کر سکتے ہیں کہ وہ خود کسی غلط روش کے دلدادہ ہیں۔ اسلامی مملکت میں ایسے امور میں حکمران اور رعایا دونوں کی رہنمائی کے لیے ایک واضح قانون اور مسلک موجود ہے۔

اسلام انسان کے فطری حقوق تسلیم نہیں کرتا۔ حقوق تو مختلف النوع فرائض اور امور کی انجام دہی اور علم و تجربہ سے حاصل ہوتے ہیں۔ بالفاظ دیگر اہلیت اور قابلیت کی عدم موجودگی میں سیاسی اور سماجی حقوق کا کوئی جواز نہیں۔

مغرب میں ہر وقت حقوق حقوق کا شور مچا رہتا ہے اور ان سے بہرہ اندوزی کے لیے اہلیت و قابلیت اور استحقاق کی کوئی شرط نہیں۔ سب سے اہم حقوق یعنی اہم عوامی امور پر حق رائے دہی' حق قانون سازی اور حق حکمرانی انتہائی نااہل اور نالائق لوگوں کو دیے جاتے ہیں۔ نہایت اہم اور نازک قومی مسائل کا فیصلہ جاہلوں کے انبوہ کثیر کی رائے سے کیا جاتا ہے۔ ایسے ممالک میں اقلیت ایک ہارے ہوئے دشمن کی حیثیت رکھتی ہے اور اکثریت کے مقابلے میں اسے کوئی حقوق حاصل نہیں ہوتے خواہ اکثریت کے پاس جاہلوں اور بے عقلوں کی فوج اور اقلیت کے پاس لائق و اہل روشن فکر اور صائب الرائے لوگ ہی کیوں نہ ہوں۔

لہٰذا ان معنوں میں ایک اسلامی مملکت میں اکثریت و اقلیت کا کوئی وجود نہیں۔ اسلامی مملکت میں ایوانِ عام کے لیے انتخاب مغرب کی طرح ایسے انتخابی حلقوں سے عمل میں نہیں آتا جو ایک دوسرے کے کٹر مخالف اور دشمن ہوں جن کے لوگوں میں کوئی قابل قدر خوبیاں موجود نہ ہوں جن کا انتخاب صرف پارٹی سے وابستگی کی بدولت ہی عمل میں آتا ہے۔

اس طرح اکثریت اقلیت پر ظلم نہیں ڈھا سکتی۔ فرض کیجیے کہ کسی وقت ایوانِ عام میں ایک خاص نقطۂ نگاہ رکھنے والی اکثریت کو اقتدار حاصل ہو جاتا ہے تو وہ اقلیت اور اس کے حامیوں پر' جیسا کہ مغرب کا دستور ہے (یعنی اقلیت کے مفاد کے خلاف قانون بنا کر) ظلم نہیں کر سکتی کیونکہ اسلامی مملکت میں ایوانِ عام کو قانون سازی یا انتظامی امور کے اختیارات حاصل نہیں ہوتے۔ تمام انتظامی امور' اختیارات ریاست کے حاکم کے ہاتھ میں ہوتے ہیں اور وہ اپنے نمایندے مقرر کرتا ہے۔ وہ صرف شریعت کے سامنے جواب دہ ہے۔ قانون سازی کے تمام اختیارات فقہا کی مجلس (council of jurists) کے سپرد ہوتے ہیں۔

نئے قوانین صرف ایسے لوگ وضع کرتے ہیں جو ماہر قانون دان ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں کا انتخاب ایوانِ عام کی طرف سے ان کثیر التعداد ماہرین قوانین میں سے عمل

میں آتا ہے جو ملّی و قومی امور پر گہری نگاہ کے ساتھ اپنی فہم و فراست' لیاقت و تدبر کے لیے بھی شہرت رکھتے ہیں۔ قانون سازی روزمرہ کی ضرورت نہیں۔ اس کی ضرورت کبھی کبھار ہی پیش آتی ہے۔ اسلامی مملکت کے لیے قوانین ایسے ایوان میں نہیں بنائے جاتے جہاں ایک مقتدر فریق اپنے اقتدار و مفاد کو مستحکم کرنے اور فریق مخالف خطرات سے بچنے کے لیے باہم آویزش میں مبتلا دکھائی دیتے ہیں۔ اسلامی حکومتوں کے قوانین کی بنیاد شریعتِ اسلامیہ پر استوار ہے۔ اس لیے اسلامی مملکت کے قوانین بحیثیت مجموعی عوام کے لیے فائدہ مند ثابت ہوتے ہیں۔ ایسے قوانین باہم دیگر دشمنیوں اور مخاصمتوں میں مبتلا رہنے والے سیاست دانوں کے فکر کا نہیں بلکہ فقہا کے فکر و تدبر کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ وہ چھوٹی چھوٹی تفاصیل پر توجہ نہیں دیتے۔ ایسی چھوٹی چھوٹی باتیں جو یورپ کی پارلیمنٹوں میں پیش ہوتی ہیں وہ اسلامی حکومت میں انتظامیہ کے فیصلوں سے طے پا جاتی ہیں۔

ہم نے یورپ کے انقلابات دیکھے ہیں۔ ایسے انقلابات جو جماعت کی حیثیت کو پارہ پارہ کر دیتے ہیں۔ جو کل ظالم تھے وہ آج خود ظلم کا شکار نظر آتے ہیں۔ جو کل اپنی مظلومیت اور بے کسی کی داستانیں عام کرتے پھرتے تھے آج خود اسی طرح ظالم بن جاتے ہیں جیسا کہ کل ان پر ظلم کرنے والے تھے یعنی مقہور ظالم اور ظالم مقہور بن جاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہاں انقلاب کا مقصد سب کے لیے حقوق و امتیازات کی مساوات نہیں بلکہ اپنے مخالفوں کو کچل کر ان کے جملہ اختیارات و امتیازات جن میں دوسروں پر جور و جفا رَوا رکھنے کا حق بھی شامل سمجھا جاتا ہے' حاصل کرنا ہے۔ انقلاب کے اس مذموم مقصد کی وجہ غیر ذمہ دارانہ اقتدار اور دولت کی غلط تقسیم ہے جو نظریہ کے طور پر یورپ کی معاشرتی و سیاسی کتابوں کے علاوہ عملاً بھی یورپ کی جدید تاریخ بطور نصب العین پیش کرتی ہے۔ ایک ملک میں جس طرح ایک پارٹی اپنی مخالف پارٹی کو کچلنے پر تلی ہوتی ہے بعینہٖ اسی طرح مختلف قومیں ایک دوسری کی ہلاکت و تباہی میں مصروف اور ایک دوسری پر اپنی غلامی مسلط کرنے میں مشغول دکھائی دیتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عیسائیت کا معاشرتی و سیاسی نظام بغیر کسی مستحکم بنیاد کے ہے۔ یہ نظام اس اقتدار سے

محروم ہے جس کا احترام سب پر واجب ہے۔ یورپی نظام اس قوت و اقتدار سے محروم ہے جو اسلامی شریعت اپنے سیاسی و معاشرتی نظام کے لیے مہیا کرتی ہے۔ یورپی نظام اس اقتدار و قوت کے سوا جو انسانوں نے ہوسِ اقتدار میں قوت کے بل بوتے پر عارضی طور پر قائم کر لیا' کسی اعلیٰ تر اقتدار اور اعلیٰ ترین قانون سے انکاری ہے۔ شاعرِ مشرق نے اسے ''کہ تہذیبِ فرنگی بے حرم ہے'' کہا تھا۔

چونکہ مغربی نظام میں کوئی معین و مقرر حدود نہیں ہیں سوائے ان کے جو حالات عائد کریں اس لیے سیاسی و معاشرتی نظام کے لیے تحفظات کا وجود مفقود ہے اور جہاں لوگ ان فطری یا خدائی قوانین سے' جن پر ایک مضبوط و مستحکم سیاسی و معاشرتی عمارت کی بنیاد رکھی جا سکتی ہے' قطعاً ناواقف ہیں۔ اس لحاظ سے یورپ عیسائیت سے پہلے کی رومی سلطنت کے زمانے میں آغازِ عیسائیت کے بعد کے زمانے میں زیادہ ترقی یافتہ تھا کیونکہ کافر رومی تو کلیسا کی نسبت اس دنیا سے زیادہ دلچسپی رکھتے تھے۔ اہلِ روما نے شرافت اور انسانیت کو اپنا شعار بنایا اور غیر ذمہ دارانہ قوت کے نظریہ کو عیسائیت کے طرزِ عمل کے خلاف بلا مقابلہ نہ چھوڑا۔ ان کے ہاں ایک افسرِ اعلیٰ ہوا کرتا تھا جس کا نام عوامی وکیل تھا۔ اس کا کام یہ تھا کہ عوام کی طرف سے حکومت سے اس کے کسی بھی کام پر جواب طلبی کرے۔ عوامی وکیل عموماً اپنے اس حق کا استعمال کیا کرتا تھا۔ اس رومی طریقہ کو بڑی حد تک قرونِ وسطیٰ کی جمہوریتوں نے بھی استعمال کیا۔ اس میں مشرق کی ان نئی اقوام کی آزاد روایات بھی شامل تھیں جنھوں نے سلطنت روما کا اس کے عہدِ انحطاط میں خاتمہ کر دیا تھا' لیکن کلیسا نے ہمیشہ اس کی مخالفت کی کیونکہ اس کے عقیدے کے مطابق مذہب کی منزلِ مقصود اگلے جہان میں ملنے والی چیز تھی۔ اس لیے عیسائیت نے اللہ کی حکمرانی کو اس دُنیا میں قائم کرنے کے بجائے اسلامی نظریے کے بالکل برخلاف دنیوی قرار دیے جانے والے حلقے میں غیر ذمہ دارانہ قوت کے نظریے کی تائید و حمایت کی اور ان لوگوں کو کڑی سزائیں دیں جو زمین پر اللہ کی حکمرانی کے قیام کو ایک حقیقت سمجھتے تھے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے غیر ذمہ دارانہ ہوسِ اقتدار کے انسداد کے لیے عیسائیت نے جو سب سے مستحسن

خدمت انجام دی ہے وہ ''اللہ کا امن'' ہے جس کی بدولت سال کے چند مخصوص دنوں میں جنگ کی ممانعت تھی اور کسے معلوم نہیں کہ جاہلی عربوں میں بھی اس قسم کا قانون مروج تھا۔ عیسائیت نے دُنیا کی دوسری بڑی خدمت یہ انجام دی کہ سود کی اسی شدومد سے ممانعت و مذمت کی جس طرح اسلام نے کی ہے۔

ازراہِ کرم میرا مطلب سمجھنے میں غلطی نہ کیجیے۔ مسیحی کلیسا نے مصیبت میں مدد کے لیے اور یورپ کے زخموں کے علاج کے لیے واقعی قابل قدر خدمات انجام دیں۔ عیسائیت نے بلاشبہ امن کے گیت گائے۔ لیکن عوام سے بہت دُور رہتے ہوئے اس نے رہبانیت ہی کو جنت کے راستے کا نشان قرار دیا۔ اس طرح عیسائیت عام زندگی سے بہت الگ تھلگ اور اس کے لیے ایک اجنبی سی چیز تھی اور اس کی یہ روش غیر ذمہ دارانہ قوت کے نظریے پر کوئی موثر قدغن ثابت نہ ہوسکی۔ البتہ یہ اعتراف ضرور کرنا پڑے گا کہ بعض صوفی منش لوگوں نے ایسا کرنے کی کوشش ضرور کی۔ قرونِ وسطیٰ کا کلیسا ابن الوقتی میں مبتلا رہا اور اس نے زیادہ تر غیر ذمہ دارانہ نظریۂ قوت کی تائید وحمایت میں اپنا زور صرف کیا۔ کلیسا کا ایک فرزند' پوپ الیگزنڈر ششم کا بیٹا بورجیا' غیر ذمہ داری کی ایک مثال بن گیا۔ قیصر بورجیا اپنے عہد کا سب سے بڑا ظالم و جابر شخص تھا۔

میکیاولی جو اپنی جمہوریہ کی بدعنوانیوں اور بدانتظامیوں سے انتہائی مایوس اور نااُمید تھا' قیصر بورجیا کے سفاکانہ طریق کی کامیابی سے اس قدر متاثر ہوا کہ اسے بے پناہ جبر واستبداد' ظلم وستم' قتل و غارت گری ہی حکومت کی کامیابی کی موثر ترین اور بہترین کلید دکھائی دی۔ قیصر بورجیا ہی درحقیقت میکیاولی کی مشہور عالم تصنیف ''دی پرنس'' کا ہیرو ہے۔ یہ کتاب بعد میں یورپی حکومتوں کے لیے ایک الہامی کتاب کا درجہ حاصل کرگئی۔ گلیڈسٹون برطانوی وزیراعظم جو اپنی مذہب پرستی اور جمہوریت پسندی کے لیے مشہور ہے۔ میکیاولی کے شہزادہ کو سیاسیات میں اسی طرح اپنا آئیڈیل سمجھتا تھا جس طرح پروشیا کا بادشاہ فریڈرک ولیم اور ملکہ کیتھرائن سمجھتے تھے۔ 'دی پرنس' اللہ کی حکمرانی کا صریح انکار ہے۔ کیونکہ یہ کتاب انسانوں کی حکمرانی سے آگے کسی کی حکمرانی کا اعتراف نہیں کرتی۔

اسی طرح عیسائیت کے پاس معاشرتی عمل و ربط ضبط کے سلسلے میں کوئی واضح اور معین نصب العین نہیں تھا کیونکہ عیسائی کلیسا کا نصب العین حقیقی زندگی سے بعید اس سے دور کا واسطہ بھی نہ رکھتا تھا۔ عالمِ عیسائیت میں دولت اور جائداد پر قبضہ اور ان کا انتظام و انصرام ان پابندیوں سے آزاد رہا ہے جو ایک عملی مذہبی حکومت ان پر عائد کرتی ہے۔ عوامی طبقہ بالعموم امراء سے حسد کرتا اور توازن قائم کرنے کے بجائے چاہتا ہے کہ اسے بھی امراء جیسے امتیازات حاصل ہوں۔ اس طرح ان کا معاشرہ توازن سے محروم ہے اور فلسفیانہ غور و فکر کرنے والا سیاست دان اپنی تسلی کی خاطر اسے مشین کے کسی اہم پرزے کی خرابی سے تعبیر کرتا ہے لیکن درحقیقت یہ خرابی کسی ایک پرزے کی نہیں پوری مشین کی خرابی بن جاتی ہے۔ یورپ کا وہ توازنِ اقتدار جس کا وکٹورین عہد میں بڑا غلغلہ تھا اب مکمل طور پر ختم ہو چکا ہے۔ آج وسطی یورپ تباہ و برباد ہو چکا ہے۔ کیا ان واقعات اور حالات میں کوئی چیز ہمارے لیے قابل تقلید ہے؟ خاص طور پر ایسے لوگوں کے لیے بھی جو ایسے ادارے رکھتے ہیں جو سیاسیات اور عمرانیات کے میدانوں پر پوری طرح سے قابض ہیں۔

پہلی جنگ عظیم کے بھیانک تجربے سے جو سبق اخذ کیا گیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ مغربی تہذیب اس راہ پر گامزن ہونے کی وجہ سے جو سراسر ہلاکت اور تباہی کا راستہ ہے' ایک صدی کے اندر اندر مٹ جائے گی۔ یہ خطرہ یورپ میں بہت سے لوگ محسوس کر رہے ہیں جیسا کہ ان کی اس سے بچ نکلنے کی کوششوں سے واضح ہوتا ہے۔ اقوامِ عالم کے باہمی جھگڑوں کے تصفیہ کے لیے ہیگ کنونشن اور جمعیتِ اقوام قائم ہوئی۔ سرمایہ داروں اور مزدوروں کے درمیان تلخی کم کرنے کے لیے مزدوروں کی انجمنیں اور مصالحتی کونسلیں یورپ میں قائم ہو رہی ہیں لیکن یہ کون نہیں جانتا کہ جمعیتِ اقوام اور ہیگ کنونشن بڑے بڑے مجرموں کے انسداد اور بیخ کنی سے قاصر ہیں۔ ان کی کوششیں اور اختیارات چھوٹے چھوٹے مجرموں کی سرکوبی کے لیے وقف ہیں۔ یقین کیجیے مقصدِ اعلیٰ میں مکمل تغیر و تبدیلی کے بغیر کامیابی ممکن نہیں۔ جب تک دُنیا ڈنڈے کی پوجا کرنی چھوڑ کر ایک

حاکمیت اعلیٰ اور ایک برتر قوت کو تسلیم نہیں کر لیتی، کبھی امن و چین نہ پا سکے گی۔ ایک فرانسیسی مزاح نگار والٹیئر نے سچی بات کہی تھی کہ: ''اگر خدا نہ ہوتا تو اسے ایجاد کر لیا جاتا''۔ مغربی سیاست دانوں کو اگر خدا پر اعتقاد نہ ہو تب بھی انھیں اپنے افعال و اشغال میں اس کے وجود کا اعتراف ہے۔ اگر وہ یورپ اور دُنیا کو ایک مسلسل خطرے سے نجات دلانا چاہتے ہیں تو انھیں مملکتِ الٰہیہ کے اصول یعنی انسانی قوانین سے زیادہ بہتر اور بالاتر قانون اور سزا اور جزا کے اصول پر ایمان لانا ضروری ہوگا۔

اسلام کی سیاسی و معاشرتی ہیئت میں ایک اقتدارِ اعلیٰ موجود ہے جسے سب تسلیم کرتے ہیں۔ ہر اسلامی ادارے اور شعائر کی اساس وہ اصول وعقائد ہیں جن کے سامنے ہر مسلمان سر جھکاتا ہے۔ اسلام نے انسان کی ترقی کی ہوس اور اس کی حیلہ سازیوں کو حدود اللہ کے اندر محدود کر دیا ہے اور یہ حدود ایسی ہیں جن کا احترام ہر مسلمان پر لازم ہے اور جن سے تجاوز کرنا سراسر گمراہی اور سرکشی ہے۔ یہی حدود اللہ درحقیقت افراد و قوم کے حقوق کی تحفظات ہیں۔ اسلامی مملکت میں غیر ذمہ دارانہ قوت و اقتدار، دولت اور حکومت و سیاست یا اسی نوع کی کسی غیر ذمہ دارانہ حرکت کی کوئی گنجائش نہیں۔ مسلمان کی دولت اور قوت اللہ کی قائم کردہ حدود کی تابع ہیں۔ مسلمان ان حدود کا احترام کرتا ہے اور ان کو تسلیم کرتا ہے۔ مسلمان کو عطا کردہ قوت و دولت کا صحیح استعمال شریعتِ اسلامی نے معین و مقرر کر دیا ہے۔ کاروباری اور تجارتی معاملات میں بھی حدود مقرر کر دی گئی ہیں۔ معاہدات اور عہد و پیمان کا احترام لازم قرار دیا گیا ہے۔ سود اور جوا مسلمانوں کے لیے حرام قرار دیا گیا ہے۔ اسی طرح نجی معاملات اور ذاتی کردار پر بھی حدود متعین ہیں مثلاً نشہ آور اشیاء کا استعمال ممنوع ہے۔ عورتوں سے مساویانہ اور حسن وسلوک کی تاکید ہے۔ نوکروں پر مہربانی اور غریب غربا کی مدد کی ہدایت ہے۔ غریب رشتہ داروں سے فیاضانہ سلوک کا حکم ہے۔ وراثت کا ایک مستقل اور معین قانون موجود ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ: ''وارثوں کے خلاف کی جانے والی کوئی وصیت قابل قبول نہیں''۔ سرمایہ دار اور مزدور، آقا اور غلام کے تعلقات پر نہایت عمدہ حدود قائم ہیں۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ مبارک ہے کہ ''جس دولت کا صحیح یعنی شریعت کے مطابق استعمال کیا جائے وہ دُنیا کے لیے باعث رحمت ہے اور ایک شخص کے لیے مباح ہے کہ وہ جائز طریقوں سے اپنی دولت میں اضافہ کرے یعنی سودخوری اور دوسرے ظالمانہ اور ناجائز طریقوں سے دولت کمانے اور اس میں اضافہ کرنے کی ممانعت کی گئی ہے۔

- امراء سے ٹیکس وصول کر کے غربا میں تقسیم کرنا چاہیے۔
- وہ مسلمان نہیں جو خود تو پیٹ بھر کر کھانا کھائے اور اس کا پڑوسی فاقے سے ہو۔
- مزدور کو اس کی مزدوری اس کا پسینہ سوکھنے سے پہلے ادا کر دو۔

اُصولِ جنگ اور قومیت

اسلام کا اپنا ایک ضابطۂ جنگ ہے جس کی رو سے معاہدات کا احترام لازم ہے۔ دشمن کی فصلیں، کھیت، عمارات، مکانات اور دیگر ضروریاتِ زندگی کے دوسرے سامانات تباہ کرنے کی ممانعت ہے۔ غیر فوجی یا عام آبادی سے کوئی تعرض نہ کرنے کی تاکید ہے۔ ایسے دشمن سے جو ہتھیار ڈال دے، رحم دلانہ سلوک کا حکم ہے۔ اور اسی طرح کے دوسرے قوانین موجود ہیں جن کا میں پہلے تذکرہ کر چکا ہوں۔ سیاسی چال بازی کی ممانعت ہے اور مسلمانوں کی طرف سے جارحانہ کارروائیوں پر پابندیاں عائد ہیں۔ ارشادِ رسولؐ ہے:

> وہ ہم میں سے نہیں جو ظلم میں اپنے قبیلے کا ساتھ دیتا ہے۔ وہ بھی ہم میں سے نہیں جو ناانصافی میں دوسروں کو مدد کے لیے پکارتا ہے۔ نہ ہی وہ ہم میں سے ہے جو اس حالت میں مرے کہ ظلم میں اپنے قبیلے کی مدد کر رہا ہو۔

یہی وہ مناہات تھیں جنھوں نے تمام اسلامی ممالک سے جارحانہ قوت کے جذبے کی بیخ کنی کر دی۔ آپ لوگوں کو میرا اس وقت اس قسم کی باتیں کرنا جب کہ عالم اسلام میں ترکی قومیت، مصری قومیت، شامی قومیت اور عراقی قومیت کے نعرے بلند ہو رہے ہیں، بے محل نظر آتا ہوگا۔ لیکن اسلامی ممالک میں جو آج قومیت کی صدائیں بلند

ہو رہی ہیں وہ یورپی استعماریت کے خلاف شور وغل کے سوا اور کچھ نہیں۔ اسلامی ممالک میں باہمی مخاصمت و مخالفت سے اس قومیت کو دُور کا واسطہ بھی نہیں بلکہ قومیت کے ان ہنگاموں میں پان اسلام ازم کے لیے ایک نئی گرم جوشی پائی جاتی ہے۔ آج اسلام کے جسد میں ہر رنگ ونسل اور ہر قوم و قبیلے کے لیے ایک گرم جوش جذبۂ اخوت ہی شاید ہماری واحد متاعِ گراں ہے۔ جسے ہم دوسروں کے سامنے اسلام کا سب سے بڑا کارنامہ کہہ کر پیش کر سکتے ہیں۔ آج جب کہ شرعی حدود کا مکمل اور پورا پورا احترام مفقود ہے اور اسلامی حکومت کے قلعے کی فصیلیں بعض مقامات سے شکست و ریخت کا شکار ہو چکی ہیں' لیکن ان کی اب بھی مرمت کی جا سکتی ہے۔ اخوت اسلامیہ ہی ہماری وہ گراں قدر متاع ہے جس سے دُنیا کا دامن خالی ہے۔ انھی حدود کی بدولت اسلامی تہذیب اپنی سالمیت اور شان وشوکت کے ساتھ بنی اُمیہ کے عروج و زوال' خلافت عباسیہ کے عروج و زوال اور چنگیز خان اور اس کی اولادوں کی ستم رانیوں جیسے انقلابات سے گزر کر ہم تک پہنچ گئی۔ اسلامی تہذیب کی سالمیت آج بھی بحال اور قائم ہے۔ اس سلسلے میں کوئی غلط فہمی نہ ہونی چاہیے۔ شریعت آج بھی ملت اسلامیہ کا معزز و محترم قانون ہے۔ ترک اپنی تمام اصلاحات میں قدم قدم پر اصلاحات کے خلاف بھی شریعت ہی کی آڑ لیتے ہیں۔ روس کے بالشویکی مسلمان بھی یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ بالیشوازم جیسی جس چیز کا انھوں نے تجربہ کیا ہے وہ خلاف شریعت نہیں۔ ہر مسلمان کی خواہش ہے کہ شریعت کو اس کی ابتدائی اور اصل صورت میں موجودہ زمانے کے حالات و مسائل پر منطبق کر دیا جائے۔ مسلمانوں کا باہمی اختلاف' مفہوم کی تفصیلات اور ان طریقوں تک جو اس مقصد کے حصول کے لیے اختیار کرنے چاہییں' محدود ہے۔ انھی حدود کی بدولت اگرچہ ان پر مکمل طور پر عمل درآمد نہ ہوا۔ عالمِ اسلام میں اس وقت لاکھوں عیسائیوں' یہودیوں' ہندوؤں' پارسیوں' بدھوں اور کنفیوشش کے پیروؤں کو صدیوں تک امان ملتی رہی۔ جبکہ یورپ میں اس زمانے میں غیر عیسائیوں کو مکمل نیست و نابود کر دیا جانا مذہبی فریضہ سمجھا جاتا تھا۔ یہ انھی حدود کا احترام تھا جو ترکوں نے گیلی پولی میں اپنے وطن کے دفاع کے لیے لڑتے ہوئے جرمنوں

کی مہیا کردہ زہریلی گیسیں انگریزوں کے خلاف استعمال کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ انھی حدود نے انتہائی جابر و قاہر اور مطلق العنان حکمرانوں اور حکومتوں کے تحت بھی اسلامی اخوت کے عالم گیر جذبے کو زندہ رکھا اور انھی حدود نے اسلامی سیاست کو اشتراکیت اور جمہوریت کے مصائب سے محفوظ رکھتے ہوئے پوری قوم کے اندر اشتراکیت کے روشن پہلوؤں اور جمہوری ارتباط و اختلاط کی خوبیوں کو قائم رکھا۔

یہ مقامِ حیرت ہے کہ ہم مسلمان اب تک اپنے مذہب کی طرف سے معین کردہ سیاسی ادارات پر یقین رکھتے ہیں اور ہمارا یہ یقین و اعتقاد پختہ تر ہوتا چلا جارہا ہے۔ ہم مغرب کی مادی خوش حالی کی پیدا کردہ خطرناک معاشرتی و سیاسی ابتری سے بچنے کے لیے اپنے انھی ادارات کو ذریعۂ نجات سمجھتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ شاہ پسند، آئین پسند اور اشتراکی کمیونسٹ سب ہی کو ایک ہی لڑی سے منسلک کر دیا جائے تاکہ موجودہ تہذیب کو جو بلاشبہ ہر اعتبار سے ایک ارفع اور اعلیٰ ترین تہذیب ہے، اس تباہی و بربادی سے بچایا جا سکے جو اسے اندر ہی اندر کھوکھلا کر رہی ہے۔ جب تک شریعت کو اقتدارِ اعلیٰ حاصل ہے، مسلمانوں کے لیے حکومت، خواہ وہ تاحیات منتخب کردہ صدر کی ہو، موروثی بادشاہت ہو، مطلق العنان حکمرانی ہو یا جمہوری ہو، حتیٰ کہ سوویت سوشلسٹ ری پبلک بھی ہو تو کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔ شہزادہ سعد حلیم پاشا کی تجویز کردہ اسلامی ریاست کا خاکہ درج ذیل ہے:

اسلامی ریاست

اسلامی ریاست میں انتظام و انصرام، تعلیم، پالیسی اور عام معاملات میں دینی اور دنیوی کا امتیاز ختم ہو جاتا ہے۔ جن لوگوں کے نزدیک بادشاہت اور حکومت صرف اللہ ہی کے لیے سزاوار ہے ان کے لیے بھلا دنیا دین سے کیسے جدا ہو سکتی ہے؟ مسلمانوں کے نمایندے احکامِ دین کی عملی پابندی کے لیے مشہور علمائے باعمل میں سے مجلس قانون ساز کے اراکین منتخب کریں گے۔ مسلمانوں کا اولین فرض یہ ہے کہ وہ اس جھوٹی مشیخت اور ملائیت سے نجات حاصل کریں جسے سعد حلیم پاشا دنیائے اسلام کی گمراہی اور ضلالت کا

سب سے بڑا اور بنیادی سبب گردانتے ہیں۔ جب مملکت اس اسلامی انداز پر منظم ہو جائے گی اور اسے اسلامی اخلاقیات' سیاسیات اور عمرانیات کے ماہرین کے مشورے حاصل ہوسکیں گے تو شریعت کے بنیادی اصولوں کو مدنظر رکھتے ہوئے حسب ضرورت نئے قوانین وضع کرنا شروع کر دے گی۔ شریعت کے بنیادی مسائل میں قانون کی نظر میں مرد و زن کی مساوات ان کے لیے حصولِ تعلیم کا عالم گیر اہتمام اور مکمل مذہبی آزادی شامل ہیں۔

سود کی ممانعت ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ یہ مسلمانوں کے لیے صریحاً حرام اور قطعاً ناجائز ہے کہ کسی شخص کی تکلیف اور مصیبت سے ناجائز فائدہ اٹھایا جائے۔ اس لیے ایک اسلامی ریاست میں سود اور ضروریاتِ زندگی کی فروخت سے ناجائز منافع اندوزی کی ممانعت ہوگی۔ نشہ آور اشیا کی خرید و فروخت اور قمار بازی کی بھی قطعاً ممانعت ہوگی۔ زکوٰۃ اور بیت المال کا جن کی بدولت قوم میں منصفانہ تقسیم عمل میں آتی ہے' قیام عمل میں آئے گا۔ شریعت اسلامیہ کی حدود کے اندر حق ملکیت تسلیم کیا جائے گا اور لوگوں کے درمیان عہد و پیمان کا احترام کیا جائے گا۔ شادی ایک معاشرتی یا دیوانی (سول) معاہدہ سمجھی جائے گی جس میں طلاق اور نکاح کی سہولتیں میسر ہیں اور جس کی بدولت طلاق کسی رسوائی یا بدنامی کا باعث نہیں ہوتی۔ اسلامی شادی مرد اور عورت کو شرافت کی حدود میں رہتے ہوئے زیادہ سے زیادہ آزادی دیتی ہے اور دونوں کی فلاح و بہبود کو پیش نظر رکھتی ہے اور بچوں کی پرورش و نگہداشت کی ضامن ہوتی ہے۔ عورتوں کے تحفظ کے لیے مرد و زن کے آزادانہ میل جول پر مناسب قدغن ہوگی۔ اسلامی قانونِ وراثت کو اس کی اصل صورت میں استوار کیا جائے گا جو افراد کے پاس زیادہ سے زیادہ دولت اکٹھی ہونے کو روکتا ہے اور عورتوں کو ترکہ میں ان کا جائز حق عطا کرتا ہے۔

اسلامی ریاست میں عورت کی ذات اس کے حقوق اور اس کی املاک کی حفاظت و احترام کیا جائے گا۔ بچوں' بالخصوص یتامیٰ کے حقوق کی حفاظت کی جائے گی اور مملکت پر ان کے حقوق تسلیم کیے جائیں گے۔ اسلامی ریاست میں عالم گیر فوجی تربیت کا اہتمام کیا

جائے گا اور یہ جبری بھرتی سے ایک مختلف چیز ہوگی۔ جہاں تک خارجہ پالیسی کا تعلق ہے۔ معاہدات کا احترام کیا جائے گا۔ جارحانہ قومیت اور جنگ بازی کی ممانعت ہوگی۔ اگر دوسری اقوام کی جارحانہ پالیسی کے سبب اسلامی ریاست جنگ پر مجبور ہوجائے تو اسلام کے ضابطۂ جنگ کی پوری پوری پابندی کی جائے گی۔ یعنی وہ تمام آبادی جو جنگ میں شامل نہ ہوئی محفوظ و مامون رہے گی۔ دشمن کی معیشت برباد نہیں کی جائے گی۔ کسی ایسے مہلک اور تباہ کن ہتھیار کا استعمال نہ کیا جائے گا جو دشمن بھی مسلمانوں کے خلاف استعمال نہ کر رہا ہو۔ شکست خوردہ دشمن کے لیے معافی اور بخشش کا اعلان ہوگا۔ میرے خیال میں اسی خاکے کو موجودہ زمانے کی ایک مہذب ترین حکومت کا ترقی پسندانہ پروگرام قرار دیا جا سکتا ہے۔

میں سعد حلیم پاشا کے خیالات میں اپنی دلچسپی کی وجہ سے شاید اس مسئلہ کی تفصیل میں بہت دُور نکل گیا ہوں۔ یہ تفصیلات آج ہمارے لیے ضروری نہیں۔ ہندستان میں اس وقت کسی اسلامی سلطنت کی بنیاد ڈالنے کی مہم درپیش نہیں۔ سعد حلیم پاشا کو یہ مہم درپیش تھی۔ ہماری فوری ضرورت صرف اس قدر ہے کہ مسلمانوں کی روبہ زوال قوم کو جو دوسری اقوام کے ساتھ اس برصغیر میں آباد ہے اور ایک ایسے طرزِ حکومت کے تحت زندگی بسر کر رہی ہے جس میں اس کے احیائے نَو کا کافی امکان موجود ہے' اصلاحِ احوال کا راستہ بنایا جائے۔

یہاں ہمیں انتخابِ صدر کے مسئلہ سے سروکار نہیں' نہ ہی ایوانِ عام یا ایوانِ علماء کے انتخاب کا مسئلہ ہمیں درپیش ہے۔ ہمارے پیشِ نظر ان عظیم الشان قوانین شریعت اور ان مقامی اداروں کے احیاء کی ضرورت ہے جو خلافت راشدہ کے زمانے سے اسلامی ممالک میں جوں کے توں چلے آ رہے ہیں۔ اگرچہ ہندستان میں یہ اپنی اصلی حالت برقرار نہیں رکھ سکے۔ میں یہاں یہ کہنے کی جسارت کروں گا کہ تاریخ ہند سے میری معمولی سی واقفیت میرے دل میں یہ شک اُبھارتی ہے کہ آیا حقیقی اسلامی ادارے ہندستان میں کبھی قائم بھی ہوئے تھے؟ دوسرے ممالک میں انؐ کے نشانات سے ان کے قیام کا آج

بھی بآسانی سراغ لگایا جا سکتا ہے۔

اشاعتِ تعلیم اور تعلیم کی نوعیت

جہالت کی لعنت کو دُور کرنا آپ کا مقدم ترین فریضہ ہے۔ جہالت ہی دراصل مسلمانوں کی موجودہ ذلت ونکبت کا اصل سبب ہے۔ اسلام اور جہالت میں بعد المشرقین ہے۔ یہ دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اسلام تو ہم پرستی اور مُلّا ازم کا نام نہیں جو اندھیرے اور گندے ماحول ہی میں پرورش پا سکتے ہیں۔ اسلام صحت بخش اور بصیرت افروز روشنی کا مذہب ہے۔ یہ اللہ کی پیدا کی ہوئی کائنات کی حقیقت کا مذہب ہے۔ شجرِ اسلام کو اپنی بالیدگی و سربلندی کے لیے علم اور روشنی کی ضرورت ہے۔ اس لیے ہمارا فرض ہے کہ ہم ہر مسلمان مرد اور عورت کے لیے عہدِ حاضر کے عام اور عہدِ جدید کی روشنی کے حصول کا اہتمام کریں۔ تعلیم عام ہونی چاہیے' ساتھ ہی اسلامی بھی ہونی چاہیے۔ ہمارا نظام تعلیم ایسا ہرگز نہ ہونا چاہیے جو عہدِ حاضر کی تمام عملی طور پر سودمند اور منفعت بخش مادی معلومات کو دُنیوی قرار دے کر ان سے کنارہ کرلے بلکہ ہمارے نظام تعلیم کے لیے یہ لازم ہے کہ ہماری قدیم علمی روایات کو زندہ کرے اور تمام علوم کو مذہب ہی کا مرتبہ عطا کرے۔ ہمارے نظامِ تعلیم کے لیے لازم ہے کہ تمام علوم کے لیے اپنی مسجدوں کے دروازے کھلے رکھے۔ موجودہ عہد کی سائنس میں کوئی ایسی چیز نہیں جس سے مسلمان خائف ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ سائنس تہذیب اسلامی کے عہدِ شباب کے علوم کا ایک نتیجہ اور تسلسل ہے۔ سائنس حقیقی اسلامی تعلیمات کی مخالف نہیں۔ بلکہ خود ان کا ایک جزو ہے۔ ہمارے دیہاتوں کی مساجد' ہمارے مکتب اور شہروں میں ہماری مساجد ہی ہماری دانش گاہیں ہونی چاہییں۔ آپ جدید ترین تعلیم کو نصاب میں شامل کر دیجیے۔ پھر وہ بھی اسلام سے باہر کی نہیں سمجھی جائے گی۔ بشرطیکہ مسلمان خود اس فراموش شدہ حقیقت کا ادراک کر لیں۔ قدیم دستور کے مطابق ہر وہ شخص جو کسی مضمون پر دسترس رکھتا ہے' درس دے سکتا ہے اور ہمارے ملک میں ایسے بے شمار لوگ موجود ہیں۔ اس ملک میں ہمارا اولین فریضہ جہالت کی تاریکیوں کو دُور کرنا ہے۔ اس جہالت نے ہمارے بے شمار

ہم مذہبوں کے دماغوں کو کند اور ملک و ملّت کے لیے بے شمار مصائب و مسائل پیدا کر رکھے ہیں۔

جب انسانوں کے دل و دماغ تعلیم کی روشنی سے منور ہوں گے تو اسلامی سائنس آرٹ اور ادب کی نشاۃِ ثانیہ کے دور کا آغاز ہوگا۔ مجھے اس بارے میں جداگانہ طور پر کچھ کہنے کی ضرورت نہیں کیونکہ اس کی کوئی الگ اہمیت نہیں۔

اخوت

اس امر کو ہرگز فراموش نہ کیجیے کہ سب مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں اور ہمارے مذہبی احکامات جو قرآن پاک اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے ہم تک پہنچے ہیں' مسلمانوں میں باہم بھائی چارے اور اتحاد و اتفاق کے طلب گار ہیں۔ حالات چاہے کچھ بھی ہوں اور کوئی خواہ کچھ بھی کہے آپ اخوت سے متعلق احکامات و فرمودات کو ایک لایعنی اور فرسودہ آئین سمجھنے کی غلطی ہرگز نہ کیجیے۔ اگر اسلامی بھائی چارے کا جذبہ مردہ ہو چکا ہے تو پھر یہ احکام بھی بے معنی ہیں۔ لیکن یہ تعلیم ہرگز فرسودہ اور وقت کے تقاضوں کے خلاف نہیں ہے۔ کیونکہ بنی نوع انسان کو اخوت کی جیسی ضرورت آج ہے ویسی اس سے پہلے کبھی نہ تھی۔ مسلمانوں میں نماز پنجگانہ' حج' روزہ اس قلبی و روحانی فیض کے قطع نظر جو مسلمانوں کو ان سے حاصل ہوتا ہے' آج بھی ہمیشہ کی طرح دُنیا کے سامنے قوموں' زبانوں' ذاتوں اور جماعتوں کے اتحاد کے شان دار اور فقید المثال نمونے ہیں۔

زکوٰۃ کا احیاء

اگر آپ مسلمانوں کو زوال و انحطاط سے بچانا چاہتے ہیں اور ان میں قوت و استحکام پیدا کرنا چاہتے ہیں تو آپ کو نظامِ زکوٰۃ کو اس کی اوّلین بنیادوں پر استوار کرنا چاہیے اور اس کی تحصیل و تقسیم کا منصفانہ انتظام کرنا چاہیے۔ اور یہ کام ہر دیہات' ضلع اور شہر میں انتہائی دین دار اور صاحب فراست لوگوں کے سپرد کرنا چاہیے تاکہ بیکاری'

گداگری اور غربت کا خاتمہ ہو سکے اور اس طرح غریب مسلمان بھائیوں کے دلوں میں ایک آزادانہ اور دیانت دارانہ زندگی کی لگن پیدا ہو سکے۔

سود

مسلمانوں کو اگر اپنے آپ کو سود کی پرچھائیں سے بھی بچانا چاہیے۔ میں اس بات سے خوب آگاہ ہوں کہ موجودہ زمانے کے مالی اور تجارتی نظام گذشتہ عہد کے نظاموں سے مختلف ہیں۔ قرآن پاک تجارت کو حلال اور سود کو حرام قرار دیتا ہے۔ سوّد ایک ضرورت مند بھائی کی مجبوری اور بے بسی سے ناجائز فائدہ اٹھانے کا نام ہے اور تجارت اپنے بھائی کو اس کی ضرورت کی چیز مناسب قیمت پر دینے کا نام ہے۔ قرآن پاک میں ربوا اور تجارت کا مفہوم یہی ہے۔ میری رائے میں عہدِ حاضر کی بہت سی تجارتیں اصطلاحاتِ قرآنی میں تجارتیں نہیں بلکہ ربوا ہیں۔ اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اکثر ایسی قسم کے سود جن کی بدولت کسی کو مبتلائے مصیبت و اذیت نہیں ہونا پڑتا۔ مسلمان ربوا نہیں سمجھتے ممکن ہے ایسا ہی ہو لیکن اخوتِ انسانی کے نقطۂ نظر سے اگر غور فرمایئے تو ایسے تمام معاملات حد درجہ قابلِ نفرت دکھائی دیں گے۔ ہمارے موجودہ نظام کا عام معاشرتی اثر مجموعی طور پر احساسِ اخوت کے لیے سمِ قاتل ہے۔ کیا وجہ ہے کہ ہر سوشلسٹ پروگرام میں سود کی بیخ کنی کو بنیادی مقام حاصل ہے؟ اس کی کیا وجہ ہے کہ جب روس میں کمیونسٹوں نے اقتدار حاصل کیا تو انھوں نے سب سے پہلا کام جو کیا وہ سود کو مٹانا تھا۔ وجہ یہ ہے کہ وہ سرمایہ دارانہ نظام جس کی بنیادیں سود پر استوار کی گئی ہیں ایک صدی سے بھی کم عمر پانے پر آج یورپ میں ہر جگہ اپنے دمِ آخرین پر ہے۔ سود کے مخالفین کے خیال میں سودی نظام پر مبنی سرمایہ داری بے شمار معاشرتی مسائل و مصائب پیدا کرتی ہے اس لیے جذبۂ اخوت و محبت کی پاسداری کے لیے مسلمانوں کے باہمی لین دین میں سود کا ہرگز دخل نہیں ہونا چاہیے۔ اگر ہم لعنت سے نہیں بچ سکتے تو اسے ان قوموں سے لین دین تک محدود کر دینا چاہیے جن کے ہاں سود ایک مستحکم و مضبوط ادارہ ہے اور اس صورت میں بھی اسے عام کاروباری ضروریات تک ہی محدود رہنے دینا چاہیے اور اصلی

اسلامی نظام کو زندہ کرنا چاہیے جو حقیقی ضرورت کے وقت ان کی مدد کر سکے۔ یہی ادارہ انھیں نمود و نمایش، فضول خرچی اور بیکار قسم کے قرض لینے سے باز رکھے اور اس طرح ہندستانی مسلمانوں کی اقتصادی زبوں حالی کے ایک سبب کا انسداد کر دے۔ قوم کی معاشی حالت سدھارنے اور اسلامی اخوت کے تحفظ کے لیے پرانی اقتصادی نظام میں آپ کو ہر سوال اور اُلجھن کا حل مل جائے گا اور میں آپ کو مشورہ دوں گا کہ اس مسئلہ کا کامل توجہ اور غور و خوض سے مطالعہ کریں۔ اگر ہم نے یورپی طرائق کو اختیار کیا تو یہ دونوں مقاصد باہم دیگر متصادم ہوں گے۔

نشہ آور اشیا، جوا، اور سود خوری کو اپنے سماجی اور انفرادی اثر و رسوخ سے بند کر دیجیے۔ وراثت کے اسلامی اصول پر خلوصِ دل سے عمل کیجیے۔ حالت اور ناخواندگی کے خلاف باقاعدہ جنگ کیجیے اور اپنے اسلامی فرائض کی انجام دہی میں منہمک ہو جائیے۔ زکوٰۃ کی باقاعدگی ادائگی شروع کر دیجیے۔ بیت المال کا مقام عمل میں لائیے۔ ان تمام شرعی احکامات کی پوری پوری اطاعت کیجیے تو آپ بہت جلد موجودہ منتشر اور پریشان حال بکھرے ٹوٹے گروہوں کی جگہ مسلمانوں کو ایک انتہائی منظم، ترقی یافتہ اور مرفوع الحال قوم میں بدل دیں گے۔

تقدیر پرستی ـــــ جہاد اور طریقۂ انتخاب

میں اس سے پہلے بھی آپ سے عرض کر چکا ہوں کہ مسلمانوں پر تقدیر پرستی کا الزام قطعاً بے بنیاد ہے۔ اس میں کوئی صداقت نہیں۔ اسلام کے خلاف تو یہ الزام حددرجہ غیر منصفانہ ہے۔ لیکن مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد کے خلاف یہ الزام واقعی صحیح ہے۔ تعلیماتِ اسلامی سے بے بہرہ جاہل مسلمانوں میں واقعی احمقانہ قسم کی تقدیر پرستی پائی جاتی ہے۔ ان کی یہ تقدیر پرستی جہاد کے غلط مفہوم پر مبنی ہے جسے کفار کے خلاف جنگ آزمائی تک ہی محدود کر دیا گیا ہے۔ جبکہ کافروں کے خلاف صرف ان کے کفر کی وجہ سے جنگ کا کہیں حکم نہیں دیا گیا۔ البتہ مسلمانوں کو بدی کے خلاف باطل کے جارحانہ حملے کے خلاف، تن آسانی اور کاہلی کے خلاف، حقوق کی حفاظت کے لیے، گندگی اور

جہالت کے خلاف ہر مقام اور ہر شعبۂ زندگی میں حتیٰ کہ ان کے گھروں کے اندر اور ان کے نفس کے خلاف بھی جنگ کا حکم ضرور دیا گیا ہے۔

ایک سچے مسلمان کی زندگی جہاد سے عبارت ہے۔ جب اس کی زندگی جذبۂ جہاد سے ضیاء و ارتفاع حاصل کر لیتی ہے تو اسے اس حد تک تقدیر پرستی کا اختیار حاصل ہو جاتا ہے کہ اس اطمینان کے ساتھ کہ وہ اپنی بساط کے مطابق اپنا فرض ادا کر رہا ہے' اسے اس کی پرواہ نہیں رہتی کہ اسے کیا پیش آ رہا ہے۔ اسے اللہ کے وعدے پر اعتبار ہوتا ہے:

وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ○ (البقرہ ۲:۱۱۲)

اور ایسے لوگوں کے لیے کسی خوف یا رنج کا کوئی موقع نہیں۔

اگر اسلام کو دنیائے جدید کے سامنے پیش کیا جانا ہے تو مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ زندگی کے ہر شعبے میں جذبۂ جہاد کو زندہ کر کے دکھائیں۔ ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ حق کی حمایت اور باطل کی مخالفت میں ہمیشہ سینہ سپر رہیں اور اس طرح دُنیا میں اپنے لیے اس عزت و افتخار کو دوبارہ حاصل کر لیں جو کبھی ان کے آباؤ اجداد کو حاصل تھا۔ دوسری اقوام میں اسلام اور اسلامی ادارات صرف اسی صورت میں قبولیت حاصل کر سکتے ہیں جب خود ہمارا طرزِ عمل ان کے نزدیک اسلامی اور مستحسن ہو۔ ہم دوسری اقوام کے ادارات اور شعائر کو اپنے ادارات اور شعائر کی جگہ نہیں اختیار کر سکتے۔ اگرچہ یہ ممکن ہے کہ پورے تدبر و فکر کے بعد ہم اپنے ادارات کے ساتھ ساتھ دوسری قوموں کے بعض مفید ادارات کو اپنا لیں۔ مسلمانوں کو بحیثیت ایک قوم منظم ہو جانا چاہیے ورنہ وہ اپنی مکمل حکومتِ الٰہیہ جو موجودہ زمانے میں ان کے لیے ایک گراں قدر تحفے سے کم نہیں' کی قوت سے محروم ہو جائیں گے۔ ہندستان میں مسلمانوں کے لیے اپنی تنظیم اور اپنے ادارات کو اچھی طرح اور بہتر طریقے سے قائم کرنے میں کوئی رکاوٹ نہیں۔

جہاں تک ہندستان کے مسلمانوں کی تنظیم کا تعلق ہے ان کے دانش وروں کی ایک کونسل کا قیام عمل میں آنا چاہیے' جو ان کے معاملات کی انجام دہی پر نگران ہو۔ یہ کونسل ان میں تعلیم و تعلّم عام کرے۔ اصلاح و احیاء کی کوششوں میں ربط پیدا کرنے کے

لیے وہ ہر گروہ اور ضلع میں اسلامی نظام کے قیام کی کوشش کرے۔ یہاں ہمیں پھر ایک اسلامی مملکت کے نظام کی طرف متوجہ ہونا پڑے گا۔ لیکن اس کے اُونچے طبقات کی طرف نہیں جن کی تعمیر کی کوشش سعد حلیم پاشا نے کی بلکہ اس کے نچلے اور درمیانی طبقے کی طرف توجہ دینی ہوگی۔ اسلامی ریاست میں حلقۂ انتخاب محدود ہوتا ہے تاکہ لوگ ان نمایندوں میں سے جو ان کو اپنے آپ میں سے منتخب کرتے ہیں، اچھی طرح واقف ہوں۔ اور یہ حلقۂ انتخاب ان لوگوں پر مشتمل ہوتا ہے جن کے قول و فعل میں تضاد نہیں توافق ہوتا ہے تاکہ نمایندہ واقعی اپنے عہدے کا اہل ثابت ہو۔ آپ کہیں گے کہ ایسی صورت میں تو ہمیں پارلیمنٹ کے لیے اراکین کی بڑی بھاری تعداد درکار ہوگی۔ لیکن میں یہاں ممبرانِ پارلیمنٹ کا نہیں بلکہ ایک معمولی سے نمایندہ ادارے یا ایوان کا ذکر کر رہا ہوں مثلاً گاؤں کی پنچایت یا کوئی تجارتی مجلس۔ ایسی ہر مجلس اپنے اراکین میں سے ایک رکن کا انتخاب کرتی ہے اور اس طرح منتخب کیے ہوئے نمایندے شہر کی کونسل یا ضلع کی کونسل کے اراکین بن جاتے ہیں اور اسی طرح ضلع کی کونسلیں صوبائی کونسل کے لیے اپنے اپنے نمایندے منتخب کرتی ہیں اور صوبائی کونسلوں کے نمایندے اسی طرح ایوانِ عام کے لیے نمایندے منتخب کرتے ہیں۔

یہ طریقۂ انتخاب پارلیمانی طریقۂ انتخاب سے مختلف ہے لیکن اس کے فوائد بے پناہ ہیں مثلاً ہر صورت میں ہر حلقۂ انتخاب مکمل طور پر اس فرض کی انجام دہی کا ہر طرح سے اہل ہے۔ اعلیٰ ایوانات کے لیے جن لوگوں کو منتخب کیا جاتا ہے ان کی اپنے انتخاب کے لیے اہلیت مسلمہ ہوتی ہے۔ حکومت خود اختیاری کا یہی پرانا نظام ہے۔ مثلاً نظامِ شیوخ جسے ہر طرح سے اسلامی جمہوری نظام کہا جا سکتا ہے جہاں تک مجھے معلوم ہے یہ نظام مشرق میں جہاں کہیں بھی آزادانہ طور پر زیرِ عمل آیا ہے، ہمیشہ کامیاب رہا ہے۔ اس نظام کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کی بدولت اعلیٰ اوصاف و کردار کے حامل ایسے لوگ جنھوں نے زندگی بھر عوام کی خدمت کی، حکومتی ایوانوں میں پہنچ سکتے ہیں۔ میں آپ لوگوں سے استدعا کرتا ہوں کہ آپ اپنی قومی تنظیمات اور ادارات میں یہی طریقۂ

انتخاب اختیار کریں۔

مسلمان عورتیں

میں نے ہندستان میں ہندستانی عورتوں کی حیثیت کے بارے میں اپنے خیالات کا بلاکم و کاست اظہار کر دیا ہے۔ مسلمان عورتوں کا حال ہمارے یہاں خاصا اصلاح طلب ہے۔ ان کی حالت سدھارنے کی اشد ضرورت ہے۔ آپ ارشادِ نبویؐ کے مطابق انھیں زیورِ تعلیم سے آراستہ کرنے کی کوشش کیجیے اور انھیں وہ مواقع اور سہولتیں مہیا کیجیے جو ان کی فطری خوبیوں اور صلاحیتوں کی نشوونما کے لیے ضروری ہیں۔ اپنی فطری صلاحیتوں کی نشوونما کے لیے ان کا حق بھی اسی طرح مسلّم ہے جیسا کہ مردوں کا۔ اور جو شخص عورتوں کو ان کے اس حق سے محروم رکھنے کی کوشش کرتا ہے وہ انتہائی ظالم ہے۔

اسلامی اور غیر اسلامی ادارے

مسلمان غیر مسلموں کے آئین اور ادارات نہیں اختیار کر سکتے لیکن دوسری اقوام کے ادارات اور رسوم و رواج کا احترام ان پر لازم ہے۔ ان پر غیر مسلموں کے ساتھ ہمسایوں جیسی رواداری اور خیر خواہی سے زندگی بسر کرنا بھی لازم ہے۔ مذہب اسلام میں عدم رواداری اور مذہبی انتہا پرستی کی کوئی گنجایش نہیں۔ قرآنِ پاک اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ عدم رواداری، مذہبی تعصب اور دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کے خلاف معمولی سی بداخلاقی کی سختی سے ممانعت کرتا ہے۔ ان لوگوں میں جو اپنے مسلمان ہونے پر فخر کرتے ہوں، مذہبی تعصب اسلامی تعلیمات سے ناواقفیت ہی کا نتیجہ ہو سکتا ہے۔ ہندستان میں مسلمانوں کی عدم رواداری ان کی مذہب سے ناواقفیت بلکہ بے گانگی کی دلیل ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کا وجود اہل ہندستان کے لیے باعث زحمت نہیں بلکہ موجبِ رحمت ثابت ہو۔ اس مقصد کے حصول کے لیے بھی اشاعتِ تعلیم کی اشد ضرورت ہے۔ مذہبی تعصب پر انتہائی ندامت اور افسوس ابھی کچھ عرصہ ہوا میں نے ایک ایسے شخص کے قتل پر محسوس کیا تھا جسے میں بے حد عزیز رکھتا تھا۔ اسلام میں کسی

شخص سے محض اختلافِ رائے یا لوگوں کو ہم خیال بنانے میں ناکامی پر نفرت و دشمنی کا کوئی جواز نہیں۔ اللہ تعالیٰ مجھے یہ کہنے سے بچائے کہ اسلام کسی شخص کے قتل کو جائز نہیں سمجھتا۔ اسلام انسانوں میں کامل انصاف کی دعوت ہے۔ یہ ایماندارانہ اختلافِ رائے کا احترام سکھاتا ہے۔ تمام نیک لوگوں کی، خواہ وہ کوئی بھی ہوں، عزت کا درس دیتا ہے۔ اسلام غیر مسلم دُنیا کا دشمن نہیں بلکہ اس کا دوست اور غم خوار ہے۔ البتہ وہ حق و باطل کی آویزش میں، جب کبھی اور جہاں کہیں بھی وہ پائی جائے ہمیشہ حق کا ساتھ دینے کی ہدایت کرتا ہے۔ میں آپ لوگوں سے پُرزور استدعا کروں گا کہ اسلامی رواداری پر دل و جان سے عمل کیجیے، اس کی اشاعت کیجیے۔ مسلمان کو تو غیر مسلم کا جامِ شراب بھی توڑ دینے کی ممانعت ہے جس سے ان کی دل آزاری ہوتی ہو۔ مسلمانوں کی رواداری دُنیا کے لیے ان کی عظمت و رفعت کا شاندار تاریخی حق ہے اور مجھے یقین ہے کہ مسلمانوں کی آیندہ رواداری ہی انسانیت کے جسد کے رستے ہوئے زخموں پر پھاہا ثابت ہوگی۔ اس رواداری کو دوبارہ عملی طور پر زندہ کر دکھائیے۔ اس اعتبار سے بھی مسلمانوں میں ضبط و تنظیم کی ضرورت ہے۔

آج کتنے ہی اپنے آپ کو مسلمان کہنے والے لوگ بالکل اسی طرح یہ کہتے ہوئے سنے جاتے ہیں جس طرح ان سے قبل عیسائی اور یہودی کہا کرتے تھے کہ جنت صرف ان کی قوم کے لیے وقف کی جا چکی ہے اور دوسروں پر اس کی پرچھائیں تک حرام ہے یعنی قرآنِ پاک کی زبان میں:

إِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰى وَالصّٰبِئِيْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ○ (البقرہ ۲: ۶۲)

یقین جانو کہ نبی عربیؐ کے ماننے والے ہوں یا یہودی ہوں یا صابی، جو بھی اللہ اور روزِ آخر پر ایمان لائے گا اور نیک عمل کرے گا اس کا اجر اس کے ربّ کے پاس ہے اور اس کے لیے کسی خوف یا رنج کا موقعہ نہیں ہے۔

وَقَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ط تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ ط قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ○ بَلٰى ق مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗٓ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ○

(البقرہ ۲: ۱۱۱-۱۱۲)

ان کا کہنا ہے کوئی شخص جنت میں نہ جائے گا جب تک وہ یہودی نہ ہو یا (عیسائیوں کے خیال کے مطابق) عیسائی نہ ہو۔ یہ ان کی تمنائیں ہیں۔ ان سے کہو اپنی دلیل پیش کرو اگر تم اپنے وعدے میں سچے ہو۔ دراصل نہ تمہاری کوئی خصوصیت ہے نہ کسی اور کی۔ حق یہ ہے کہ جو بھی اپنی ہستی کو اللہ کی اطاعت میں سونپ دے اور عملاً نیک روش پر چلے اس کے لیے اس کے رب کے پاس اس کا اجر ہے اور ایسے لوگوں کے لیے کسی خوف یا رنج کا کوئی موقع نہیں۔

قرآن کا راستہ